



ناول.....پری زاد: یہ دنیا ظاہر پرستوں کا ڈیرہ ہے.....

من کتنا ہی میلہ کیوں نہ ہوتن اجلا ہونا چاہیے، انسان کی سب سے بڑی دشمن اس کی توقعات ہیں، دنیا کے بد صورت آئینوں کے مقابل.....اک حسن پرست کا فسانہ.....ہاشم ندیم

Novel: PariZaad
Written by: Hashim Nadeem
Compiled by: Muhammad Bilal Ashraf

All Episodes: 1 - 28

Hashim Nadeem khan is a Baloch play writer whose literary services recently awarded by "Poona festival award" .The famous baloch writer Hashim Nadeem was born in Quetta and got his early education from there.He obtained his intermediate education from cadet college Pataro and entered in the field of medicine. After getting medicine education from Bolan medical college of Quetta he involveled himself in Blochistan civil service as assistant commissioner.

PariZaad was Published in Jang Sunday Magzine.

ہاشم ندیم نوجوان نسل کے پسندیدہ، مُلک کے معروف و منفرد رمارائٹر، ناول نگار ہیں۔ ان کے ناول ”خدا اور محبت“ اور ”بچپن کا دبیر“ نے بین الاقوامی پذیرائی حاصل کی، تو جنگ، سنڈے میگزین میں شائع ہونے والے ناول ”عبداللہ“ کو بھی وقت کے پسندیدہ ترین ناول کا درجہ حاصل ہوا۔ انہیں ان کی ادبی خدمات پر حکومت پاکستان نے تمغہ حسن کارکردگی سے نوازا۔ نیز، فلم کے شعبے میں ”عبداللہ“ نامی ایک بین الاقوامی فلم کے تخلیق کار کی حیثیت سے بھی قدم رکھ چکے ہیں۔

”پری زاد“ ایک اچھوتے، حساس اور قدرے مشکل موضوع پر مبنی بہت دل گداز سی تحریر ہے، یہ ایک ایسے شخص کی کتھا ہے، جسے اک کم صورتی کے عیب کے سبب، اس ظاہر پسند، زر پرست دنیا کے اُن گنت بد صورت رویوں، بد ہیئت آئینوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ملاحظہ کیجیے، ہمارے ”نئے نولے“ ناول کی پہلی قسط۔ ناول سے متعلق اپنی آراء سے آگاہ کرنا ہرگز مت بھولیے گا۔ ہمارا پتا وہی پرانا ہے:

نرجس ملک، ایڈیٹر، ”سنڈے میگزین“ روزنامہ جنگ، شعبہ میگزین، اخبار منزل، آئی آئی چندریگر روڈ، کراچی۔ ای میل:

sundaymagazine@janggroup.com.pk

ایک سرائیکی گیت ہے ”میرے محبوب یہ تیری یک بارگی جدائی بڑی جان لیوا ہے..... مگر تجھے مجھ سے بچھڑنا ہی ہے، تو دھیرے دھیرے قسطوں میں بچھڑ.....“ اس بار کا موسم گرما بھی کچھ اسی سنگ دل محبوب جیسا روپ دھارے، دھیرے دھیرے قسطوں میں بچھڑنے کے جن کر رہا تھا۔ تیز گرم تپتی دھوپ میں کول تار کی لمبی سنان سڑک کسی سیاہ گلیشیر سے لکھلی ہوئی جھیل جیسی چمک رہی تھی۔ میرے پرانے فلیٹ جو توں کا تلواینبے سے کئی جگہ سے گھل چکا تھا، لہذا اہلتا ہوا کول تار میرے پیروں میں انگارے بھر رہا تھا۔ اسکول کی چھٹی کے بعد گھر تک یہ راستے کا پہل صراط مجھے ہر روز ہی پار کرنا ہوتا تھا۔ کتنی بار دے لفظوں میں اماں کو بتا چکا تھا کہ میرے پیروں کے چھالے اب شمار کی حد سے نکلتے جا رہے ہیں، مگر نو بہن بھائیوں میں سے فریاد کا میرٹ نکالا جاتا، تو میری عرضی کا نمبر چھٹا تھا اور ابا کی تنخواہ بس اتنی کہ وہ صرف اماں ہی کی سُن سکتے تھے۔ راستے سے گزرتے ہوئے حسب معمول چند لمحوں کے لیے جو توں کی بڑی دکان کے چھتر تلے سستانے کے لیے ٹھہرا اور ہمیشہ کی طرح حسرت بھرے تجسس کے ساتھ دکان کی شیشے کی دیوار سے ہاتھوں کا کٹورا بنا کر جھانکنا شروع کر دیا۔ اندر ایک ملازم، ایک میم صاحب کو اس کی پسند کے سینڈل پہنا کر جانچ کر واپس کر رہا تھا۔ کتنی پیاری تھی، وہ گوری سی میم، دودھ میں دھلی، آبشار کی جلتہ رنگ کی مانند نکھری نکھری سی..... مگر خیالات کا تسلسل جلد ہی ٹوٹ گیا، کیوں کہ شاید پہلے دکان کے مالک اور پھر ملازم نے بھی مجھے دیکھ لیا تھا۔ ملازم تیزی سے باہر آیا اور حقارت بھرے لہجے میں مجھے جھڑکنے لگا۔ ”اوئے! کتنی بار تجھے کہا ہے کہ یہاں شیشے کے پاس کھڑا نہ ہوا کر، سارا شیشہ گندا کر دیا۔ چل بھاگ یہاں سے، ورنہ مار کھائے گا۔“ میں جلدی سے گھبرا کر اپنا بستہ سنبھالے آگے بڑھ گیا۔ یہ نفرت و حقارت، یہ رویہ میرے لیے، کوئی نیا نہیں تھا۔ بچپن ہی سے مجھے ایسے تحقیر آمیز رویوں کا سامنا تھا، اور پھر لوگوں سے کیا گلہ، شکوہ، میری صورت، میرا حلیہ ایسے رویے، ایسی ہی نفرت و حقارت کا متقاضی تھا۔ میں اپنے ماں باپ کا چھٹا بچہ تھا۔ ابا ایک شربت پیک کرنے والی کمپنی میں کام کرتے تھے۔ صبح سے شام تک بوتلوں کو گنتے کے ڈبوں میں بھر کے شام کو جب گھر آتے تو ان کے غصے کا جن کھل چکا ہوتا۔ اور پھر ہم سب کونوں کھدروں میں دبک کر باقی کا دن گزارا کرتے۔ قلیل تنخواہ، ضروریات، مہنگائی اور پرے نو بچوں کی فوج۔ کبھی کبھی تو مجھے لگتا کہ یہ جو غریب والدین ہوتے ہیں، یہ اپنی غربت بانٹنے کے لیے ہی اپنا آنگن بچوں سے بھر لیتے ہیں یا پھر شاید یہ ان کا غربت سے کوئی انتقام ہوتا ہے۔

وہ سردیوں کی ایک طویل اور کٹھن رات تھی، جب میرا جنم ہوا۔ نانی بتاتی تھیں کہ میری پیدائش کے وقت حسب معمول کم خوراک کی وجہ سے اماں کی صحت اور طبیعت کافی بگڑی ہوئی تھی۔ نتیجتاً میری صورت میں ایک کم زور، لاغر اور گہرے سانولے رنگ کا بچہ اس دنیا میں وارد ہوا۔ باقی بہن بھائی پھر بھی کافی بہتر اور کھلی ہوئی گندی رنگت لیے پیدا ہوئے تھے۔ یہ نہ جانے قدرت نے ساری سیاہی میرے مقدر کی دوات ہی میں کیوں انڈیل دی تھی۔ چھوٹی خالہ کی، اماں سے ہمیشہ ہی کچھ نہ کچھ کھٹ پٹ چلتی رہتی تھی، انہیں تو جیسے موقع ہی مل گیا۔ جھٹ بولیں۔ ”آئے ہائے باجی! یہ اتنا کالا کلوٹا سا بچہ کس پر چلا گیا، لگتا ہے، جیسے آنگن میں اماں کی رات اُتر آئی ہے۔“ اماں جو پہلے ہی میرے رنگ کی وجہ سے جلی بھنی پڑی تھیں، تملایا تو گئیں ”جیسا بھی ہے، ہے تو میری ہی اولاد۔ ویسے تمہاری اس بھنگی بیٹی سے تو زیادہ ہی پیارا ہے۔“ اب جلنے کی باری خالہ کی تھی، وہ بھی تڑپ کر بولیں۔ ”ہاں ہاں، بڑا کوہ قاف کا شہزادہ بنتا ہے تم نے۔“ اماں بھلا کہاں پیچھے رہنے والی تھیں۔ ”ہاں میرے لیے کوہ قاف کا شہزادہ ہی ہے، اور میں نے تو اس کا نام بھی شہزادوں جیسا سوچ رکھا ہے۔“ ”پری زاد“ ہاں، بس یہی نام ہوگا، میرے بچے کا۔“ ”پری زاد“ آس پاس موجود سب ہی عورتیں زیر لب بڑ بڑائیں اور کن انکھیوں سے ایک دوسرے کو اشارے کرتی باہر نکل گئیں۔ ”پری پیکر تو سنا تھا، یہ پری زاد بھلا کیا نام ہوا۔“ بس وہی دن تھا، جب میری قسمت میں ہمیشہ کے لیے لوگوں کی نظر میں تسخّر، طنز اور حقارت لکھ دی گئی تھی۔ کاش! اُس روز اماں چھوٹی خالہ کے طنز کے جواب میں خاموش رہتیں تو میری زندگی اتنی تلخ نہ ہوتی۔ میری کالی سیاہ رنگت، لاغر جسم اور غیر دلکش نین نقش والی مسکین سی صورت کا تعارف جب پری زاد کے نام سے کروایا جاتا تو سُننے والا خود بخود تہہ لگانے پر مجبور ہو جاتا۔ مجھے یاد ہے، جب مجھے پہلی جماعت میں داخل کروایا گیا تو استاد نے سب بچوں کو فرداً فرداً کھڑا کر کے ان کے نام پوچھے تھے۔ میری باری آئی، تو میں نے

کھڑے ہو کر معصومیت سے اپنا نام بتایا۔ ”پری زاد“ استاد چند لمحے حیرت سے میرے پرانے لباس اور خلیے کو دیکھتے رہے، پھر مجھے دیکھ کر زور سے ہنس پڑے۔ ”واہ شہزادے..... نام تو بڑا اکمال رکھا ہے، ماں باپ نے.....“ استاد کی بات پر باقی بچے بھی زور زور سے ہنسنے لگے۔ تب میری سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ آخر میرے نام میں ایسی کیا خامی ہے کہ جو بھی سُنتا ہے، مذاق اڑاتا ہے، مگر پھر دھیرے دھیرے مجھے احساس ہوتا چلا گیا کہ مسئلہ نام کا نہیں، صورت کا ہے۔ اور پھر اسکول ہی کیا، گلی، محلے اور بازار میں، جہاں بھی میرے نام کی شہرت پہنچتی، پہلے تو لوگ اچنبھے کا شکار ہوتے اور پھر مجھ پر نظر پڑتے ہی ان کی حیرت ایک طنزیہ مسکراہٹ میں تبدیل ہو جاتی۔ مگر میں اُس وقت ایک ناسمجھ بچہ تھا، نہیں جانتا تھا کہ اس دوغلی دنیا میں انسان کا من چاہے، جتنا بھی میلا ہو، خُن ضرور اُجلا ہونا چاہیے۔ بندے کے دل میں چاہے کتنا ہی کھوٹ ہو، چہرے اور صورت میں کوئی کھوٹ نہیں ہونا چاہیے۔ کیوں کہ یہ دنیا ظاہر پرستوں کا ذریعہ ہے۔ روح کا اُجلا پن اور خوب صورتی کو پرکھنے والی آنکھیں ان بے بصیرت لوگوں کے پاس کہاں.....؟

میری بد نصیبی کی داستان یہیں ختم نہیں ہوتی تھی۔ میرے ساتھ یہ مذاق تب سنگین تر ہونے لگے، جب شاید ڈھائی یا تین سال کی عمر ہی سے میرے من میں اُنھی ”خوب صورتی کی چاہ“ کو اُس پاس کے لوگوں نے محسوس کرنا شروع کر دیا۔ اماں بتاتی تھیں کہ بھری پُری محفل میں جب کوئی مجھے پکارتا، تو میں درمیان میں بیٹھی درجن بھر عورتوں کو چھوڑ کر صرف اُسی کی گود میں جا بیٹھتا، جو اس محفل میں سب سے اُبلے چہرے والی ہوتی تھی۔ خوب صورتی کی یہ چاہ صرف خوب صورت چہروں تک ہی محدود نہیں تھی، مجھے قدرت کی بنائی ہر خوب صورت چیز سے پیار ہو جاتا تھا، چاہے وہ پھول ہوں، رنگ، خوشبو، آسمان یا بادل۔ کوئی دُھن ہو، بارش یا برف سے سجا کوئی نظارہ، کچھ بھی ہو۔ مجھے یاد ہے، میں اسکول کے رستے میں آنے والی ایک تصویروں کی دکان کے باہر گھنٹوں کھڑا خوب صورت نظاروں والی تصاویر کو دور ہی سے دیکھ دیکھ کر خوش ہوتا رہتا تھا، مگر مجھ جیسے غریب خاندان میں پیدا ہونے والے بچے کے اندر بچپن ہی یہ خُسن پرستی تو جیسے دُہرا عذاب بن گئی۔ شاید دنیا کی ہر خوب صورت چیز پر صرف حسین لوگوں ہی کا حق ہوتا ہے۔ بد صورت لوگوں کے لیے ہر طرف صرف بد صورتی ہی پہنچتی ہے۔ سو، میرے اُس پاس بھی ہر لمحہ وہ بد صورتی ہی بھٹکتی رہتی، چھوٹا سا کچا گھر، کچرے سے اُٹی گلیاں، دھول اڑاتا محلہ اور سب سے بڑھ کر لوگوں کی کرخت اور بد صورت سوچ اور نظریں۔

اس پر طر فہ تماشا یہ کہ پانچویں جماعت میں، جس دن اسکول میں چیچک سے بچاؤ کے ٹیکے لگانے والی سرکاری ٹیم آئی تھی، اُس روز میں نہ جانے کس وجہ سے اسکول ہی نہیں جا پایا اور ٹھیک ایک ماہ بعد میرے چہرے پر عجیب سے سرخ سرخ دانے ابھرتے دیکھ کر اماں نے چلا کر ابا سے کہا کہ ”پری زاد کے باوا، یہ لڑکے کا چہرہ تو دیکھو، یہ کیسے دانے ہیں؟“ ابا بھاگم بھاگ مجھے لیے سرکاری اسپتال ٹیکا لگوانے پہنچ تو گئے، مگر تب تک بیماری اپنا کام کر چکی تھی اور پھر جب چند ہفتوں بعد زخموں کا کھر نڈ اتر تو بیماری ساری عمر کے لیے چہرے پر چیچک کے بد نما داغوں کی نشان چھوڑ چکی تھی اور ان داغوں سے بھی کہیں زیادہ گہرے داغ اور زخم تو مجھے ان لوگوں کی باتوں نے لگائے، جو بظاہر تیمارداری کرنے اور اماں سے ہم دردی جتانے آتے تھے، مگر ہنسی مذاق کی تہہ میں، طنز کے ایسے نشتر اور تیر چلاتے کہ اس چھوٹی عمر میں بھی میرا دل چھلنی ہو کے رہ جاتا۔ کون کہتا ہے، انسان نے اس جدید دور میں میزائل، بم اور ڈرون ایجاد کر کے تباہی پھیلائی ہے۔ جتنا گہرا گھاؤ انسان کی زبان کسی انسان کے دل میں لگا سکتی ہے، اس کی کاٹ اور زخم کا مقابلہ، یہ نئے دور کے ہتھیار کسی صورت نہیں کر سکتے۔ کبھی کبھی میں سوچتا کہ اینٹ بم کے موجد کو شاید زبان کے زہر کا ٹھیک طرح سے ادراک نہیں ہوگا، ورنہ اسے دنیا برباد کرنے کے لیے اتنی محنت نہ کرنا پڑتی۔

شاید میرے والدین کا بھی اس معاملے میں اتنا قصور نہیں تھا۔ جب کسی غریب گھرانے میں یکے بعد دیگرے اوپر نیچے نو بچے پیدا ہو جائیں، تو پھر ان میں سے کسی ایک بچے کی حساسیت کا بھلا کسے خیال رہتا ہے۔ یہ میری اپنی بد قسمتی تھی کہ میں ایسی صورت کے باوجود بھی اندر سے بے حد حساس واقع ہوا تھا۔ کاش! انسان اس دنیا میں صرف غریب ہی پیدا ہوتا یا صرف نازک دل۔ مجھ جیسے لاکھوں کروڑوں بچے اس ملک کی ان ہی گلی کوچوں کی دھول چاٹتے رل کھل کر بڑے ہو ہی جاتے ہوں گے، مگر میری حساسیت نے میری زندگی کا خازن میرے لیے طویل تر کر ڈالا۔ میں جتنا لوگوں کی آنکھوں سے ہُچھتا، اُتنا ہی ان کی نظر میں آ جاتا تھا۔ اور پھر میرے اندر پلتا وہ ایک خُسن پرست پری زاد، جسے ہر خوب صورت چہرہ اس قدر لبھاتا تھا کہ دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی تھی۔ مجھ سے بڑی تین بہنیں اور سب سے بڑے دو بھائی اور مجھ سے چھوٹی ایک بہن اور دو بھائی سب ہی کی زندگی مزے میں گزر رہی تھی، کیوں کہ انہیں نہ تو اپنی زندگی سے کوئی توقع تھی، اور نہ ہی جیون کا برتاؤ ان سے کچھ الگ تھا۔ شاید زندگی میں سب سے بڑی دشمن ہماری اپنی توقعات ہی ہوتی ہیں۔ کانٹوں میں الجھاؤ رکھنے والی امیدیں، گرم تپتی ریت پر چلنے پر مجبور کر دینے والی توقعات۔ میں آٹھویں جماعت میں تھا، جب دو بڑے بھائیوں کی اکٹھی شادی کر دی گئی، گھر میں دو افراد کا اضافہ ہو گیا اور ہم سب بہن بھائی اپنی اپنی مخصوص جگہوں سے سرکتے باہر برآمدے اور صحن میں آگئے، چھوٹے سے گھر کی تقسیم کتنی مشکل ہوتی ہے۔ جہاں باتیں تو درکنار، ایک دوسرے کی سوچ بھی سنائی دے جاتی ہے۔ لہذا دھیرے دھیرے ہم بہن بھائیوں کی سوچ بھی سرگوشیاں ہوتی چلی گئی۔ شاید مجبوری اور غلامی کی انتہا بھی یہی ہوتی ہوگی کہ انسان اپنی سوچ کی بولی بھی اونچی نہ ہونے دے، سوچنا بھی سرگوشیوں میں شروع کر دے۔

بھائیوں کی شادی کے بعد گھر کی مزید آبادی بڑھی تو ہم سب کو مزید سرکایا گیا۔ کمرے والے برآمدے میں، برآمدے والے صحن میں اور میں جو صحن میں سوتا تھا، میرے لیے فرمان صادر ہوا کہ باقی بھائی بہن چوں کہ چھوٹے ہیں، لہذا مجھے گھر کی چھت پر بنے ایک کچے گودام نما کمرے میں منتقل ہونا پڑے گا۔ چھت پر نہیں اور مٹی کا بنا یہ چھوٹا سا کمر گھر کا کٹھ کباڑ جمع کرنے کے کام آتا تھا۔ غریبوں کی زندگی میں کوئی چیز فالتو نہیں ہوتی۔ ایک سال پہلے جس شے کو فالتو کچرا سمجھ کر اس گودام میں پھینک دیا جاتا تھا۔ اگلے سال اسی کی تلاش میں اماں اور بڑی بہنیں سارا گودام الٹ پلٹ رہی ہوتی تھیں۔ میرے لیے بھی یہی حکم تھا کہ میں گودام کی تمام ”قیمتی اشیاء“ ایک طرف سلیقے سے لگا کر اپنی پرانی چار پائی اس گودام میں ڈال لوں۔ آتے وقت میں اپنی کورس کی کتابیں بھی وہیں اٹھا لایا۔ اب اسکول سے واپسی پر کھانا کھانے کے بعد میں چپ چاپ اوپر بنے ٹین کی چھت والے کمرے میں چلا آتا۔ شروع شروع میں مجھے یہاں کچھ گھٹن سی محسوس ہوئی، مگر پھر دیر دیر سے اپنی اس تنہائی سے سکون ملنے لگا۔ یہ تنہائی میرے پورے وجود میں سرایت کرنے لگی اور پھر جیسے میری، اپنی اس تنہائی سے دوستی سی ہو گئی۔ تنہائی میں ہم خود اپنے ساتھ ہوتے ہیں اور مجھ جیسا لڑکا، جسے کسی ساتھی کا بھی ساتھ میسر نہیں تھا۔ اس کے لیے اپنا یہ ساتھ کتنا غنیمت تھا۔ یہ میں ہی جانتا تھا، آہستہ آہستہ میری ہی تنہائی مجھ سے باتیں کرنے لگی۔ وہ مجھے اوروں کی طرح بد صورت، لاغر اور کم تر نہیں سمجھتی تھی۔ بلکہ میں اس کے لیے حقیقت میں ایک پری زاد تھا، وہ میرے ساتھ مختلف دل چپ کھیل کھیلا کرتی۔ میری تنہائی کبھی مجھے اسکول کا سب سے لائق ہونہار طالب علم بنادیتی، جو ضلع بھر میں اول پوزیشن لینے کے بعد کچھ کچھ بھرے ہال میں ہیڈ ماسٹر سے ٹرائی وصول کر رہا ہوتا، تو کبھی اسکول کا سب سے بہترین کھلاڑی بن کر سارے مقابلے جیت رہا ہوتا اور میری ہر کامیابی پر سارا اسکول دیوانہ وار تالیاں بجاتا۔ غرض، میری تنہائی نے میرا ہر وہ خواب سچ کر دکھایا، جس کا میں عام زندگی میں کبھی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ کلاس میں، ہمیں ایک درمیانے درجے کا شرمیلا طالب علم تھا، جس نے غیر نصابی سرگرمیاں تو دُور، کبھی نصاب میں بھی کوئی غیر معمولی کارکردگی نہیں دکھائی تھی۔ اگر غلطی سے استاد کبھی مجھ سے کوئی سوال پوچھ بھی لیتے تو میری ناگلیں کاٹنے لگتیں۔

مجھ سے بڑے بھائیوں نے تو جیسے تیسے دسویں کا امتحان پاس کر کے چھوٹی موٹی نوکریاں شروع کر دی تھیں۔ اور اب اپنی دنیا میں مگن تھے اور ان ہی دنوں، جب میں دسویں جماعت میں تھا۔ میری بڑی بہن کی بات کہیں طے ہو گئی اور اس کے سسرال والوں کی ضد کے آگے ہار کر ابا کو رخصتی کی ہامی بھرتے بنی۔ ہماری برسوں کی لگی بندھی زندگی کی روٹین میں ایک ذرا سی ہلچل پیدا ہوئی اور اماں نے آس پاس کی پڑوسنوں اور لڑکیوں بایوں کو ڈھونڈنے کے لیے ہفتہ بھر پہلے ہی روزانہ شام کو گھر آنے کی دعوت دے دی، ایسے مواقع پر میں زیادہ تر چھت پر اپنے ڈر بے نما کمرے ہی میں قید رہتا، حالاں کہ دل بہت چاہتا تھا کہ صحن میں جھانک کر محلے کی لڑکیوں کو شور و غل اور ہنگامہ کرتے دیکھوں۔ ان کی ہنسی اور قہقہوں کی آواز اوپر کمرے تک آتی، تو کئی بار چھت کی منڈیر تک بھی آتا، مگر پھر واپس لوٹ جاتا۔ اگر کسی کام سے گھر سے باہر بھی جانا ہوتا، تو چپ چاپ صحن کی پچھلی جانب سے نیچے اترتا۔

اُن دنوں سر شام ہی محلے کے نوجوان لڑکے ہماری گلی کے ارد گرد منڈلانے لگے تھے اور میری اماں یا ابا کے بلاوے پر بھاگ بھاگ کر گھر کے کام یوں کرتے، جیسے یہ ان کا فرض ہو۔ مجھ پر یہ بھیجید بہت دیر میں کھلا کہ ان میں سے ہر ایک محلے کی کسی نہ کسی لڑکی کی ایک جھلک دیکھنے کی آس میں یہ ”گلی یا ترا“ کرتا ہے۔ کبھی کبھار ان کے قریب سے گزرتے ہوئے ان کی سرد آہیں اور عشقیہ جملے میرے کانوں میں بھی پڑ جاتے۔ ”یار! کیا ہوا، وہ آئی کہ نہیں؟“ ”کہاں یار! اس کا تو گھر سے ٹکنا ہی عذاب ہو چلا ہے، ٹو بتا تیری والی آئی کہ نہیں.....؟“ ”ہاں، آئی تو ہے، پر اس کی اماں کی بڑی کڑی نگرانی ہے آج کل اُس پر، سوچتا ہوں، خط پکڑانے کی کوئی ترکیب کروں۔“ میں حیرت سے ان سب کی یہ باتیں سننا اور رشک سے ان سب کو دیکھا کرتا، میری نظر میں وہ سب لوفر بہت عظیم درجہ رکھتے تھے۔ بھلا اس دنیا میں کسی کا محبوب بننے سے بھی بڑا کوئی درجہ ہو سکتا ہے۔ عاشق تو لا کھل جائیں گے، محبوب کے درجے پر شاذ و نادر ہی کوئی فائز ہوتا ہے۔ یہ خود کو کتنا مکمل کر دینے والا احساس تھا کہ کوئی اس دنیا میں ایسا بھی ہے، جو اپنی تنہائی میں آپ کو سوچتا ہے، آپ کی فکر کرتا ہے، آپ کی یاد اس کے ہونٹوں پر ایک میٹھی سی مسکان بکھیر دیتی ہے۔ مجھ جیسے معمولی لڑکے کے لیے تو یہی زندگی کی معراج تھی کہ محلے کی کسی لڑکی نے میری طرف دیکھنا تو درکنار، کبھی ایک اچھٹی سی نگاہ بھی نہیں ڈالی۔ لڑکیاں تو لڑکیاں، مجھ سے تو محلے کے خوب رُول کے بھی بات کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔ وہ گھنٹوں آپس میں اپنے معاشقوں کی باتیں کرتے رہتے اور میں ان کے قریب بیٹھے ہونے کے باوجود کبھی اتنی توجہ کا باعث بھی نہیں بن سکتا تھا کہ ان میں سے کوئی مجھ سے اتنا ہی کہہ دے کہ ”بھائی جاؤ، جا کر اپنا کام کرو، کہاں ہمارے درمیان گھسے بیٹھے ہو؟“ ان میں سے اگر کبھی کسی کی کوئی اچھٹی نگاہ مجھ پر پڑی جاتی تو وہ بڑی بے پروائی سے کہتا ”یار پری! جلدی سے جا کر ایک ڈیہا کیپسٹن کی تو پکڑ لا۔“ ہم سب عمر کے اس دور میں تھے، جہاں گھر والوں سے چھپ کر سرگرمی چھپنا بھی ایک کارنامہ سمجھا جاتا تھا اور ان کی نظر میں میری وقعت بس اتنی تھی کہ میں ان کی یہ ہلکی پھلکی خدمت کرتا رہوں۔ یا پھر یوں کہہ لیں کہ میں ان کی نظر میں قطعی بے ضرر تھا، عاشق کو خطرہ صرف اپنے رقیب سے ہوتا ہے اور میری اتنی اوقات ہی نہیں تھی کہ میں کسی ادنیٰ درجے کے رقیب کے عہدے پر ہی فائز ہو سکوں۔

ان دنوں محلے میں ناہید نامی لڑکی کا بہت چرچا تھا۔ محلے کے سبھی لڑکوں کی نیندیں حرام کر رکھی تھیں، اس پری چہرہ نے۔ اور ہماری گلی میں جمع ہونے والی اس بھیڑ کی بنیادی وجہ بھی ناہید ہی تھی۔ کیوں کہ وہ روزانہ اپنی ماں کے ساتھ مغرب کے بعد ہمارے گھر کی تقریب میں شامل ہونے آتی تھی۔ ہمیشہ نظریں جھکائے اور سر پہ اوڑھنی اوڑھے ناہید کو میں نے بھی ایک آدھ بار گلی میں آتے جاتے دیکھا تھا۔ سفید لباس میں وہ کتنی پاکیزہ اور کتنی معصوم دکھائی دیتی تھی۔ شادی کا دن قریب تھا اور گھر میں ہنگامہ بھی اپنے عروج پر پہنچ چکا تھا، جب ایسی ہی ایک شام میں گھر کے صحن سے گزر کر کسی کام سے باہر جانے کے لیے لکھا تو صحن میں بیٹھی کسی لڑکی کی آواز سنائی دی۔ ذرا نیچے..... میں نے پلٹ کر دیکھا اور میری سانس ختم گئی، مجھے پکارنے والی کوئی اور نہیں، ناہید ہی تھی۔

(جاری ہے)

ہاشم ندیم نو جوان نسل کے پسندیدہ، مُلک کے معروف و منفرد ڈراما رائٹر، ناول نگار ہیں۔ ان کے ناول ”خدا اور محبت“ اور ”بچپن کا دمبر“ نے بین الاقوامی پذیرائی حاصل کی، تو جنگ، سنڈے میگزین میں شائع ہونے والے ناول ”عبداللہ“ کو بھی وقت کے پسندیدہ ترین ناول کا درجہ حاصل ہوا۔ انہیں ان کی ادبی خدمات پر حکومت پاکستان نے تمغہ حسن کارکردگی سے نوازا۔ نیز، فلم کے شعبے میں ”عبداللہ“ نامی ایک بین الاقوامی فلم کے تخلیق کار کی حیثیت سے بھی قدم رکھ چکے ہیں۔

”پری زاد“ ایک اچھوتے، حسّاس اور قدرے مشکل موضوع پر مبنی بہت دل گداز سی تحریر ہے، یہ ایک ایسے شخص کی کھتا ہے، جسے اک کم صورتی کے عیب کے سبب، اس ظاہر پسند، زر پرست دنیا کے اُن گنت بد صورت رویوں، بد ہیئت آئینوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ناول سے متعلق اپنی آراء سے آگاہ کرنا ہرگز مت بھولے گا۔ ہمارا پتا وہی پرانا ہے:

ایڈیٹر، ”سنڈے میگزین“ روزنامہ جنگ، شعبہ میگزین، اخبار منزل، آئی آئی چندر نگر روڈ، کراچی۔ ای میل:

sundaymagazine@janggroup.com.pk

تھوڑی دیر کے لیے تو مجھے اپنے کانوں پر یقین ہی نہ آیا۔ میں نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا، جیسے میرے پیچھے یا صحن میں آس پاس کوئی اور موجود ہے، جسے ناہید نے آواز دی ہوگی۔ مگر وہاں تو میرے سوا کوئی نہ تھا۔ میری نظر ایک پل کے لیے اس کی جانب اٹھی اور اس کی سیاہ گھنی پکوں اور بڑی بڑی خوب صورت آنکھوں سے ٹکرا کر دوسرے ہی پل زمین میں گڑ گئی۔ شاید دنیا کا سب سے بڑا لحاظ یارعب، لحاظِ حُسن، یارعبِ حُسن بھی ہوتا ہے۔ اور میرے لیے تو یہ ویسے بھی ایک ناقابلِ یقین اور ان ہونی تھی۔ میں نے اس لڑکی کے لیے محلے کے کڑیل جوانوں کو تپتی دو پہروں میں گھنٹوں اسکول کے رستے میں کھڑے جلتے دیکھا تھا، مگر وہ اسکول سے واپسی پر یا کبھی گلی محلے سے گزرتے ہوئے آنکھ اٹھا کر بھی کسی کی طرف نہیں دیکھتی تھی۔ مجال ہے، جو آج تک کسی نے اسے ننگے سر دیکھا ہو۔ آج وہی محلے کی سب سے خوب صورت لڑکی مجھ سے براہِ راست مخاطب تھی۔ مجھ سے، جسے اس کے اپنے گھر والے بھی عموماً بھول جاتے تھے۔ میں تو اگر کھانے کے لیے کبھی دیر سے چھت سے نیچے آتا، تو عام طور پر چھوٹے بہن بھائی سب صفا چٹ کر چکے ہوتے اور اماں مجھے دیکھ کر سر پیٹ لیا کرتیں کہ ”ارے..... تو تو مجھے یاد ہی نہیں رہا۔“ پھر میں کیوں حیران نہ ہوتا، جب اس نے میرا نام لے کر دوبارہ پوچھا۔ ”آپ خالہ صغراں کے بیٹے ہیں ناں..... پُری زاد.....“ میرا جی چاہا کہ اسے روک کر کہوں کہ پُری تو آپ ہیں، میں تو صرف زادی زاد ہوں۔ مگر میرے حلق سے عجیب و غریب سی آواز نکلی۔ ”جی.....“ ”آپ ذرا اس شادی کے ہنگامے سے فارغ ہو لیں، تو ایک بار ہمارے گھر کا چکر لگا لیجیے گا۔ میری امی آپ کو یاد کر رہی تھیں۔“ وہ بات ختم کر کے نہ جانے کب کی جا چکی تھی، مگر میرے قدم تو جیسے وہیں صحن کی کچی زمین میں دھنس کر رہ گئے۔ میں جانے کتنی دیر وہیں کھڑا ان چند گھڑیوں کے خواب یا گمان ہونے کے بارے میں سوچتا رہا۔ میرا ذہن یہ تسلیم کرنے کو ہرگز تیار نہ تھا کہ وہ پل حقیقت بھی ہو سکتے ہیں، جب وہ مجھ سے ہم کلام تھی۔ واقعی کچھ لوگ ہمارا نام پکاریں، تو نام بھی معتبر لگنے لگتا ہے۔

میں جیسے کسی طلسم کے زیرِ اثر باہر گلی میں نکلا تو حسبِ معمول لفظوں کی ایک ٹولی گلی کے کٹ پر جمع تھی۔ وہ سب اس کی باتیں کر رہے تھے۔ ان میں ماجد بھی تھا۔ محلے کا سب سے کڑیل اور خور و جوان، میرے ہم عمروں میں سب سے زیادہ زندہ دل اور ہر محفل کی جان، پڑھائی لکھائی میں بھی آگے اور شام کو جب محلے کے باقی لڑکے بڑے میدان میں کرکٹ کھیلا کرتے، تو ماجد کی تیز باؤ لنگ اور ہوا میں اڑتے لمبے بال دیکھنے کے لیے ہم سبھی تماشا کی گھنٹوں کھڑے رہا کرتے۔ میں چپ چاپ کھڑے کھڑے لڑکوں کی ٹولی کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ سب ناہید ہی کا ذکر کر رہے تھے۔ ان سب نے خود اپنے طور پر ہی، اپنی پسند کے مطابق محلے کی لڑکیاں اپنے ناموں سے منسوب کر رکھی تھیں۔ اور ماجد کے نام کا قرعہ اس کی جاذبِ نظر شخصیت اور ہر دل عزیز کی وجہ سے ناہید کے نام لگتا تھا۔ ماجد خود بہت عرصے سے ناہید کے گھر کے چکر کاٹ کاٹ کر تھک چکا تھا۔ مگر بقول اس کے، وہاں اس کی دال گلتی نظر نہیں آتی تھی۔ اس وقت بھی وہی ذکرِ جاناں جاری تھا۔ اکرم نے پوچھا ”یار! بتا تو سہی، کچھ بات تو کی ہوگی اس نے تجھ سے.....“ ماجد نے ایک لمبی سی سرد آہ بھری۔ ”کہاں یار..... اُس نے تو جیسے مجھ پر نظر نہ ڈالنے کی قسم کھا رکھی ہے۔ جانے کب اپنے بھاگ کھلیں گے“ پھر اچانک ماجد کی مجھ پر نظر پڑی۔ میں منہ کھولے محویت سے ان کی باتیں سن رہا تھا۔ ماجد نے ایک دم ہی مجھ سے سوال کر ڈالا۔ ”ارے پُری زاد..... تو نے کبھی کسی سے عشق کیا ہے.....؟“ سب لڑکوں نے ماجد کی بات سن کر زوردار قہقہہ لگایا۔ میں شرمندہ سا ہو گیا۔ ”میں نے..... نہیں تو.....“ ماجد سنجیدہ ہی شکل بنا کر بولا۔ ”ہر کسی کو زندگی میں ایک بار عشق ضرور کرنا چاہیے۔ عشق آدمی کو انسان بنا دیتا ہے۔“ اکرم نے شرارت سے ماجد کی طرف دیکھا اور معنی خیز لہجے میں بولا۔ ”صرف ایک بار، ذرا پھر سوچ لے ماجد۔“ سب لڑکے ایک بار پھر زور سے ہنس پڑے۔ سارا محلہ جانتا تھا کہ نہ صرف ہمارے محلے، بلکہ آس پاس کی جانے کتنی گلیوں میں ماجد کے چکر چلتے تھے۔ ایک بار تو میرا جی چاہا کہ میں بھی ان سب کو آج یہ بتا کر حیران کر دوں کہ جس ناہید کی ایک جھلک پانے کے لیے وہ سب یہاں گھنٹوں سے کھڑے ہیں، اُسی ناہید نے آج خود مجھ سے نہ صرف بات کی بلکہ اپنے گھر بھی بلایا ہے۔ مگر پھر یہ سوچ کر خاموش ہو گیا کہ بھلا کون میری بات پر اعتبار کرے گا۔ انا

وہ میری زندگی کی پہلی رات تھی، جو مجھ سے گزارے نہیں گزر رہی تھی۔ پہلے تو میں اپنے کمرے ہی میں چارپائی پر کروٹیں بدلتا رہا، پھر تنگ آکر اس جھنگا سی چارپائی کو کمرے سے باہر کھینچ کر گھلے آسمان تلے تاروں کی چھت کے نیچے ڈال دیا اور پھر ساری رات تاروں سے پوچھتا رہا کہ آخر ایسی کیا بات ہو سکتی ہے، جس کے لیے اس ”ستارہ جبین“ نے مجھے اپنے گھر آنے کو کہا ہے؟ کہتے ہیں، جادوگر اور بازیگر ہمیں گھلا دھوکا دیتے ہیں۔ یہ ہماری نظر بندی کر کے جانے کیسے کیسے کھیل تماشے دکھا جاتے ہیں۔ آنکھوں میں دھول جھونکتے ہیں، مگر اس رات مجھے یہ احساس ہوا کہ سب سے بڑا جادوگر اور ماہر ترین بازیگر تو خود ہمارے سینے کے اندر دھڑکتا یہ دل ہوتا ہے۔ جادوگروں اور بازیگر کی نظر بندی کا علاج تو شاید پھر بھی ممکن ہو، مگر اس کم بخت دل کی نظر بندی کا کوئی علاج نہیں۔ میرے دل نے بھی اس رات میری عقل پر پردے ڈال کر میری نظر بندی کر دی تھی۔ اپنے سیاہ چپک زدہ چہرے کو بھلا کر میں کسی شہزادے کی طرح ساری رات اپنے سپنوں میں ناہید کا ہاتھ تھا سے انجان وادیوں میں بھٹکتا رہا۔ کبھی کبھی ہمارے خواب بھی کتنے خوب صورت ہو جاتے ہیں، شاید اسی لیے انہیں ”خواب“ کہا جاتا ہے۔

اس رات کے بعد نیند تو جیسے مجھ سے روٹھی گئی تھی۔ جیسے تیسے کر کے میں نے شادی کے دن گزارے اور پھر رخصتی کے ٹھیک دوسرے دن جھپکتے ہوئے ناہید کے گھر کے دروازے پر دستک دے دی۔ ناہید کے ابا نے دروازہ کھولا، جنہیں ہم سب مرزا چچا کہتے تھے۔ ان کا غصہ سارے محلے میں مشہور تھا۔ ”ہاں بھئی، کیا بات ہے.....؟“ انہوں نے کڑک دار لہجے میں مجھ سے پوچھا۔ میں پل بھر کے لیے تو بوکھلاہٹ میں سب بھول گیا۔ وہ دوبارہ گرجے۔ ”اب کچھ بولو گے بھی یا یونہی منہ میں گھٹکنیاں ڈالے کھڑے رہو گے.....؟“ میں گھکھکیا ”جی..... وہ..... میں..... مجھے بلایا تھا خالہ نے.....“ انہوں نے حیرت سے مجھے ایک بار پھر سر سے پیر تک غور سے دیکھا۔ ”اندر آ جاؤ.....“ میں اس وقت کوکوس رہا تھا، جب میں نے یہاں آنے کا فیصلہ کیا تھا، بہر حال اب واپسی کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ کچھ دیر میں ناہید کی امی آگئیں اور عقدہ یہ کھلا کہ ناہید کے نوں جماعت کے پرچے ہونے والے تھے اور سالانہ امتحانات میں اسے اردو کے مضمون میں رہنمائی چاہیے تھی۔ جانے اس کی امی کو کس نے یہ کہہ دیا تھا کہ میری اردو بہت اچھی ہے۔ مجھے خود بھی یقین نہیں آ رہا تھا، کیوں کہ مجھے پوری زندگی میں آج تک اتنی اہمیت کبھی نہیں ملی تھی۔ طے یہ پایا کہ میں شام کو چار سے پانچ بجے تک ایک گھنٹہ ناہید کو اردو کی تیاری کروا جایا کروں گا۔ مرزا صاحب ٹیوشن کی فیس بھی مقرر کرنا چاہتے تھے، مگر میں نے انہیں ٹال دیا۔ ناہید کے گھر سے نکلنے کے بعد بہت دیر تک تو مجھے کچھ سمجھ ہی نہیں آیا کہ اس خوب صورت حادثے پر میرا رد عمل کیا ہونا چاہیے۔ رات تک میں ایک صدمے کی سی کیفیت میں رہا۔ صدمے کا تعلق ہمیشہ غم ہی سے نہیں ہوتا، کبھی کبھی اچانک مل جانے والی بے پناہ خوشی بھی ہمارے عمومی رویے سے متصادم ہو جاتی ہے۔ شاید ساری بات ظرف کی ہے، خوشی ہو یا غم، ہمارے ظرف کے پیمانے سے بڑھ جائے تو ہم اپنی ظاہری شخصیت کا رکھ رکھاؤ کھو بیٹھتے ہیں، میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی معاملہ ہوا اور اگلے دن، تین چار مرتبہ اماں اور بڑے بہن بھائیوں سے مختلف باتوں پر ڈانٹ پڑ گئی۔ مثلاً میں عام طور پر شاذ و نادر ہی آئینہ دیکھا کرتا تھا بلکہ سچ تو یہ ہے کہ مجھے آئینے سے ڈر لگتا تھا۔ مگر اُس روز، جب لگا تار تیسری مرتبہ برآمدے میں لگے آئینے کے سامنے سے گزرتے ہوئے میں نے شیشے میں جھانکا تو برآمدے میں کچھ کام کرتے بڑے بھائی نے مجھے گھورا ”خیر تو ہے..... یہ کنگھی پٹی آج کس خوشی میں کی جا رہی ہے؟“ میں شپٹا سا گیا۔ ”تمہارے دسویں کے امتحانات سر پر ہیں، اپنی پڑھائی کی طرف دھیان دو، آئینہ دیکھنے کے لیے ساری زندگی پڑی ہے۔“ میں جلدی سے سر ہلا کر وہاں سے ہٹ گیا۔ اس روز گھڑی کے ہندسوں کی مجھ سے جیسے کوئی جنگ سی جا رہی تھی۔ میں گھنٹہ بھر بعد بھی گھڑی کی طرف دیکھتا تو سوئی صرف چند منٹ ہی آگے کھسکی ہوتی۔ شاید گزرتے وقت کا تعلق کسی سوئی یا گھڑی سے نہیں ہوتا۔ وقت ہمیشہ ہماری لحوں کے ساتھ ضد سے ناپا جاتا ہے۔ ہماری مرضی کے خلاف ہمیشہ ہماری خواہش کے برعکس گھڑیوں کے گزرنے کو وقت کا نام دے دیا گیا ہے۔ جب ہم اسے تیز تر چاہتے ہیں، یہ سُست تر ہو جاتا ہے، اور جب کبھی ہم اس کے آہستہ پن کی دعا اور التجا میں گزر گڑا رہے ہوتے ہیں، اسے ہلک جاتے ہیں، تو پھر ہم بھولے انسان وقت کو گھڑی یا سوئی کے پیمانے پر کیوں ناپتے ہیں۔ بس، اپنے دل میں جھانک کر اپنی خواہش ٹٹول لیا کریں، وقت ہمیشہ اس کی مخالف سمت ہی دوڑتا ملے گا۔

ٹھیک چار بجے شام، میں ناہید کے دروازے پر دستک دے رہا تھا۔ گلی میں اکا دکا لوگ آ جا رہے تھے، ٹھکر ہے، اس وقت ماجد اور اس کے دوستوں کی ٹولی وہاں مورچہ جمائے نہیں بیٹھی تھی، ورنہ مجھے ہزار سوالوں کا سامنا کرنا پڑتا۔ دروازہ ناہید کے چھوٹے بھائی نے کھولا۔ اور مجھے اندر لے جا کر صحن میں لگی انگوروں کی ٹیل کے نیچے پھچی کرسی پر بٹھا دیا۔ سامنے ایک چھوٹی سی میز اور دوسری کرسی بھی رکھی ہوئی تھی۔ میرا دم بھول رہا تھا۔ دھڑکن بے قابو تھی، اور سانس رُک رُک کر آ رہی تھی۔ میں نے بچپن ہی سے اپنے لیے لوگوں کی نظر میں اس قدر تحقیر اور تمسخر دیکھا تھا کہ مجھے براہ راست اوپر دیکھنے یا سامنے والے کی آنکھوں میں دیکھ کر بات کرنے کی عادت ہی نہیں رہی تھی، لہذا جب ناہید اپنا سیاہ دوپٹا سر پر جمائے ہوئے آ کر بیٹھی، تو تب بھی میری نظریں نیچے زمین ہی میں گڑی ہوئی تھیں۔ حتیٰ کہ جب اس کے گورے پاؤں سیاہ سینڈلز میں جکڑے میری نظر کے دائرے میں آئے تو میں نے گھبرا کر اپنی آنکھیں مزید ٹھکالیں اور خود اپنے جوتوں کو دیکھنے لگا۔ ناہید نے کتابیں میز پر رکھ دیں اور شاعری کا باب نکال کر بولی۔ ”سب سے پہلے تو آپ مجھے یہ میر تقی میر اور درد کی شاعری کی تشریح کرنا سکھا دیں۔ ہمیشہ یہ سوال مجھ سے رہ جاتے ہیں۔“ میں نے کھنکھار کر گلا صاف کیا، جیسے کوئی غائب دماغ مقرر حاضرین سے کچا کھج بھرے ہال کے سامنے اسٹیج پر آ کر یک دم اپنے دماغ سے مٹ جانے والی تقریر کو یاد کرنے کی کوشش میں وقت ضائع کرتا ہے۔ پتا نہیں، میں نے شعر کی تشریح کیا کی اور نثر کا باب کہاں سے شروع کر کے کہاں ختم کیا۔ ناہید کے کول ہاتھ صفحے پلٹتے گئے اور میں اس کے ہاتھوں کی لکیروں میں اپنا ڈوبا ہوا مقدر تلاش کرتا رہا۔ ٹھیک پانچ بجے ناہید کی امی چائے کا کپ لے کر آگئیں اور میں نے حیرت سے برآمدے میں لگی بڑی گھڑی کی طرف دیکھا۔ ایک گھنٹہ گزر بھی گیا۔ پھر وہی وقت کی ہماری خواہش سے جنگ.....؟ میں چائے کا کپ ختم کر کے وہاں سے نکل آیا۔ میں نے زندگی میں کبھی نشہ نہیں کیا تھا، مگر کبھی کبھی سُرو کا تعلق صرف کسی نشہ آور شے سے نہیں ہوتا۔ کچھ پل ایسے ہوتے ہیں، جب فضا میں، ہوا میں، آس پاس کے ماحول ہی میں نشہ گھل جاتا ہے۔ کتنے خوش نصیب ہوتے ہیں وہ لوگ، جو بہن پیے، پتا کسی گناہ کے بوجھ تلے دبے اس سُرو کا نشہ لیتے ہیں۔ اس روز میں بھی پورا دن بنا کسی نشے کے سُرو میں رہا۔ مگر کہتے ہیں کہ دنیا کا ہر نشہ عارضی ہوتا ہے، عموماً رات بھر کے خمار کے بعد صبح اتر ہی جاتا ہے۔ میرا نشہ بھی صبح آئینے میں اپنا چہرہ دیکھتے ہی بھک سے اڑ گیا۔ میں بے خیالی میں کنگھی کرنے کے لیے اپنے کمرے میں لگے ٹوٹے اور میلے سے آئینے کے ایک ٹکڑے میں اپنا چہرہ دیکھ بیٹھا اور میرے سارے سپنے ٹل بھر میں کرچی کرچی ہو گئے۔ کاش یہ آئینہ ایجاد نہ ہوا ہوتا، تو ہم جیسوں کے لیے دنیا اتنی مشکل جگہ نہ ہوتی۔ اس ٹل میرا جی پاہا کہ دنیا کے سارے آئینے

توڑ ڈالوں یا کاش ایسا ہو جائے کہ دنیا کے سارے خوب صورت اندھے ہو جائیں۔ یا پھر اوپر والے نے دنیا میں ہر صورت ایک سی ہی بنادی ہوئی، تو اس بصارت یا آئینے کی ضرورت ہی نہ رہتی۔

اگلے روز ناہید کے گھر کے باہر ہی مجھے ماجد نے دھرایا۔ ”ہاں، شہزادے! کیا چکر ہے، ہماری بجنی کے گھر، وہ بھی ہم سے چُھپ چُھپ کے.....!“ میں نے ماجد کو ٹیوٹن والی بات بتائی۔ ماجد نے ایک لمبی سی سرد آہ بھری۔ ”ہاں میاں! یہی تو فائدے ہوتے ہیں لکھ پڑھ جانے کے۔ چلو عیش کرو، میری قسمت میں تو ویسے بھی اُس خالم کی نظر نہیں ہے۔ کبھی پلٹ کر دیکھتی تک نہیں۔“ پھر ماجد کو جیسے کچھ یاد آ گیا۔ ”ارے ہاں..... یاد آیا۔ یا ایک خط تو لکھ دے کسی کے نام، دراصل میری لکھائی اتنی اچھی نہیں ہے اور سُنا ہے، لڑکیوں پر اچھی لکھائی کا بڑا اثر ہوتا ہے۔“ ”کوئی اور وقت ہوتا، تو میں شاید ماجد کو نال دیتا، کیوں کہ ہر ہفتے کسی نہ کسی کے قدموں میں پھینکنے کے لیے ماجد کو ایسے خط اور رقعوں کی ضرورت پڑتی رہتی تھی، مگر اس وقت چوں کہ ٹیوٹن کا وقت نکلا جا رہا تھا، اس لیے میں نے بادلِ نخواستہ چند سطور ایک سادے صفحے پر کھینچ کر ماجد کے حوالے کر دیں۔ وصول کرنے والی کا نام اس نے نہیں لکھوایا اور اپنے نام کی جگہ بھی خالی رہنے دی تاکہ وہ اپنے ”مناثر کن“ دستخط کر سکے۔ میں جیسے تیسے جان ٹھنڈا کر ناہید کے گھر کے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ آج مرزا صاحب بھی گھر میں موجود تھے اور صحن میں بیٹھے حقہ گڑگڑا رہے تھے۔ ہماری پڑھائی کے دوران وہ بھی وقتاً فوقتاً لقمے دیتے رہے اور کچھ جگہ میری تصحیح بھی کی۔ اب انہیں کوئی بتانا کہ تصحیح ہوش مندوں کے لیے ہوتی ہے۔ مد ہوش بھلا یہ درست اور غلط کی تکرار کیا جائیں۔ ناہید کی باتوں سے اس دن میں نے اندازہ لگایا کہ اسے شعرو شاعری سے کافی لگاؤ ہے اور اسے بہت سے اچھے شعر بھی زبانی یاد ہیں۔ مگر میرے ساتھ ایک بہت عجیب سا مسئلہ یہ تھا کہ میں دن بھر شام کے چار بجنے کا انتظار کرتا رہتا۔ ہل ہل کانٹوں پر کاٹ کر گزارا کرتا، مگر جیسے ناہید میرے سامنے آتی اور اس کے حُسن کے نُور کی پہلی کرن میری آنکھوں پر پڑتی، میری نظریں خود بخود جھک جاتیں۔ مجھے ناہید کے گھر ٹیوٹن پڑھانے جاتے ہوئے سات آنٹھ روز ہو چکے تھے اور ان دنوں میں، میں نے شاید سات ہل کے لیے بھی اس کے چہرے کو براہِ راست نظر بھر کر نہیں دیکھا تھا۔ بس اس کے ہاتھ، کنگن، چوڑیوں کی کھٹکناہٹ، آواز کا زیر و بم، بالوں کی وہ ایک لمبی سی شریر لٹ، جو بار بار چہرے سے نیچے ڈھلک کر اُسے تنگ کرتی رہتی تھی، اس کی مخروٹلی انگلیاں اور اس کا وہ قلم پکڑنے کا ایک خاص انداز۔ بس یہی کچھ ان لمحوں کا سرمایہ تھا۔ ہاں البتہ ایک فائدہ مجھے یہ ضرور ہوا تھا کہ ناہید کو اردو پڑھانے کے چکر میں، میں خود دن بھر اردو کے رُتے لگاتا رہتا اور اپنے اردو کے استادوں سے اس روز کی ٹیوٹن کے باب بھی خوب اچھی طرح سمجھ کر آتا تاکہ مجھ سے کوئی غلطی نہ ہو جائے، سو اس مشق سے میری اپنی دسویں کی اردو کی تیاری بہت اچھی ہوتی گئی۔

میرے میٹرک کے امتحانات قریب آ رہے تھے۔ اسکول کی طرف سے دسویں جماعت کو شہر کے مقامی سینما میں اردو فلم دکھانے کے لیے لے جایا گیا۔ ہیرو پیا نو پر بیٹھا ایک محفل میں ہیروئن کو اپنے دل کا حال سُنا رہا تھا۔ سفید لباس میں ملبوس وہ ہیرو، پیا نو بجاتے ہوئے مجھے بہت اچھا لگا اور جانے کیوں اُسی لمحے میرے اندر بھی پیا نو سیکنے اور بجانے کی خواہش، ایک شدید کک کی صورت میں جاگ اُٹھی۔ اس رات میں نے خود کو خواب میں وہی سفید سوٹ پہنے پیا نو بجاتے دیکھا اور ناہید اسی فلم کی ہیروئن کی طرح پیا نو کے پہلو سے بڑی میرے قریب کھڑی محویت سے میری دُھن سُن رہی تھی۔ عجیب بات یہ تھی کہ خواب میں میرا چہرہ اور وجود کسی بھی قسم کے داغ دھبوں اور سیاہی سے بالکل پاک صاف تھا۔ صبح جب اچانک کسی کھٹکے سے میری آنکھ کھل گئی تو بہت دیر تک میں نے صدمے کے مارے آنکھیں میچے رکھیں۔ کچھ خواب کتنے اثر انگیز اور روح تک میں سرایت کر جانے والے ہوتے ہیں کہ بہت دن تک ہمیں اُداس اور بے چین رکھتے ہیں۔ تب ہمارا جی چاہتا ہے کہ کاش ہماری موجودہ زندگی ایک خواب ہوتی اور وہ خواب ہماری زندگی سے بدل جاتے، مگر کچھ لوگوں کے خواب، سدا خواب ہی رہتے ہیں۔ میں بھی ان ہی میں سے ایک تھا۔

ناہید کو ٹیوٹن پڑھاتے ہوئے مہینہ بھر ہونے کو آیا تھا۔ میرے نہ چاہتے ہوئے بھی اس کا کورس تقریباً ختم ہونے کو تھا، بلکہ مرزا صاحب نے تو اب ہفتے میں صرف تین دن ٹیوٹن اور تین دن خود ناہید کی اپنی دُھرائی کے لیے مقرر کر دیئے تھے۔ میری بے چینی بڑھتی جا رہی تھی، کیوں کہ میں جانتا تھا کہ چند دن بعد یہ تین دن کی ملاقات بھی ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گی۔ اس تمام عرصے میں ناہید نے مجھ سے کبھی کورس کی کتابوں اور اپنی ٹیوٹن کے ہوم ورک کے علاوہ کوئی بات نہیں کی تھی، مگر پھر بھی نہ جانے کیوں مجھے ایسا لگتا تھا کہ ہم دونوں اُس ایک گھنٹے میں زمانے بھر کی باتیں کرتے ہیں۔ شاید حُسن کی اپنی کوئی گفتگو، کوئی بولی ہوئی ہے، جسے عام لفظوں یا زبان کی ضرورت نہیں ہوتی۔ یا شاید خوب صورتی کا احساس ہی اپنے اندر سارے جہاں کی گفتگو سموئے رکھتا ہے۔ وہ کہتے ہیں ناں، تجلیے کی باتوں میں، گفتگو اضافی ہے۔ میں ناہید کے گھر سے نکلنے کے بعد بھی اُسی تجلیے میں مقید رہتا۔

اُس رات بھی میں اپنے کمرے میں گود میں کتاب رکھے اپنے آپ سے اسی گفتگو میں مصروف تھا کہ اچانک باہر گلی میں ایک شور سا اٹھا، جیسے بہت سے لوگ کسی کا چیختے چلاتے پیچھا کر رہے ہیں۔ میں گھبرا کر کمرے سے باہر نکلا اور چھت سے نیچے گلی میں جھانکا، تو عجیب سا شور مچا ہوا تھا۔ جلدی سے نیچے اتر کر معلومات کیں، تو بھانت بھانت کی باتیں سُن کر میرے تو ہوش ہی اڑ گئے۔ گلی میں چند بزرگ سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے۔ ”نہ میاں..... کوئی کسی کی چھت پر یونہی نہیں ٹاپتا۔ ضرور لڑکی کی طرف سے کوئی اشارہ ہوگا۔“ دوسرے صاحب منمنائے۔ ”ہاں بھی، یہ آج کل کی نئی نسل بھلا بڑوں کی عزت اور غیرت کیا جانے۔“ پتا چلا کہ مرزا صاحب کے گھر والے خاندان کی کسی تقریب سے واپسی پر لیٹ ہو گئے تھے۔ گھر میں صرف ناہید اور اس کا چھوٹا بھائی تھا۔ کسی پڑوسی نے اُن کے چھت پر کسی کو کودتے دیکھا تو شور مچا دیا۔ سایہ شناخت ہوئے بنا فرار ہونے میں کام یاب ہو چکا تھا، مگر اپنے پیچھے انواہوں اور بد نامیوں کا ایک سیلاب چھوڑ گیا تھا۔ مجھے ان سب پر بہت غصہ آیا کہ وہ ناہید جیسی شریف اور با کردار لڑکی پر ایسے الزامات لگا رہے تھے۔ اگلے دن بھی محلے میں یہی چرچا رہا۔ دن کے تقریباً دو بجے کے قریب کسی نے ہمارے گھر کا دروازہ بے تحاشا پیٹنا شروع کر دیا۔ سب سے پہلے اباجی اور پھر ان کے پیچھے دونوں بڑے بھائی بھی گھر سے باہر نکلے، باہر سے مرزا صاحب کے شور شرابے کی آواز آرہی تھی۔ میں بھی من گن لینے کے لیے دروازے تک پہنچا ہی تھا کہ باہر محلے داروں کی بھیڑ میں کھڑے مرزا صاحب غصے اور نفرت سے چلائے۔ ”یہ رہا..... یہاں گھر میں مچھا بیٹھا ہے۔ جیسی اس کی شکل مکروہ ہے، ویسے ہی گھناؤنے کروت ہیں اس کلوے کے۔“ میں نے حیرت سے گھبرا کر ان سب کی طرف دیکھا۔ ”جی.....؟ مگر میں نے کیا کیا ہے؟“ ”کیا کیا ہے تم نے؟ خوب..... ابھی بتاتا ہوں۔“ انہوں نے جیب سے ایک کاغذ نکال کر سب کے سامنے لہرایا۔ ”اب یہ نہ کہنا کہ یہ خط تم نے نہیں لکھا۔ تمہاری تحریر خوب پہچانتا ہوں میں لگنے۔“ میں نے پہلی نظریں میں ماجد کے لیے لکھا اپنا خط پہچان لیا اور میری زبان سے حیرت میں بے ساختہ نکلا۔ ”ہاں..... مگر یہ خط تو میں نے۔“ مگر میری بات ادھوری ہی رہ گئی اور مرزا صاحب کا ہاتھ تیزی سے گھوما اور میرے گال پر ایک زناٹے دار چاٹا پڑ گیا۔

(جاری ہے)

ہاشم ندیم نوجوان نسل کے پسندیدہ، ملکہ کے معروف و منفرد راما رائٹر، ناول نگار ہیں۔ ان کے ناول ”خدا اور محبت“ اور ”بچپن کا دبیر“ نے بین الاقوامی پذیرائی حاصل کی، تو جنگ، سنڈے میگزین میں شائع ہونے والے ناول ”عبداللہ“ کو بھی وقت کے پسندیدہ ترین ناول کا درجہ حاصل ہوا۔ انہیں ان کی ادبی خدمات پر حکومت پاکستان نے تمغہ حسن کارکردگی سے نوازا۔ نیز، فلم کے شعبے میں ”عبداللہ“ نامی ایک بین الاقوامی فلم کے تخلیق کار کی حیثیت سے بھی قدم رکھ چکے ہیں۔

”پری زاؤ“ ایک اچھوتے، حساس اور قدرے مشکل موضوع پر مبنی بہت دل گداز سی تحریر ہے، یہ ایک ایسے شخص کی کتھا ہے، جسے اک کم صورتی کے عیب کے سبب، اس ظاہر پسند، زر پرست دنیا کے اُن گنت بد صورت رویوں، بد ہیئت آئینوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ناول سے متعلق اپنی آراء سے آگاہ کرنا ہرگز مت بھولیے گا۔ ہمارا پتا وہی پرانا ہے:

ایڈیٹر، ”سنڈے میگزین“ روزنامہ جنگ، شعبہ میگزین، اخبار منزل، آئی آئی چندر نگر روڈ، کراچی۔ ای میل:

sundaymagazine@janggroup.com.pk

ستائے میں اس زوردار تھپڑ کی آواز ایسے گونجی، جیسے بم دھماکا ہوا ہو، مگر آواز کے دھماکے سے کہیں زیادہ گونج میرے اندر بہت کچھ ٹوٹ جانے کی تھی۔ مرزا صاحب نے اس طمانچے کے بعد مجھے کچھ کہنے کا موقع ہی نہیں دیا اور چیخ چیخ کر مجھے کو بتانے لگے کہ گزشتہ رات ان کی چھت پر کوئی اور نہیں، میں کو داکھا اور اس بات کی خبر ناہید کی امی کو صبح سویرے اُس وقت ہوئی، جب وہ چھت پر کپڑے ڈالنے گئیں اور انہیں وہاں ایک کونے میں میرا لکھا ہوا یہ خط مڑا تڑا سا پڑا ہوا ملا۔ وہ سب گھر والے میری تحریر اچھی طرح پہچانتے تھے، کیوں کہ ناہید کا اردو کارجر میری تحریر سے بھرا پڑا تھا۔ سارے محلے دار مجھے لعنت ملامت کرنے لگے۔ میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ کسی طرح زمین شق ہو اور میں اس میں سما جاؤں۔ مرزا صاحب کے بھاری تھپڑ کے نشان تو اگلے تین دن میں دھیرے دھیرے گال سے مدھم پڑنے لگے، مگر روح پر لگے تھپڑ کے داغ پھر عمر بھر مندمل نہ ہو پائے۔ بھیڑ کے چھتے ہی اتنا اور بڑے بھائی مجھے گردن سے پکڑ کر گھینٹے ہوئے اندر صحن میں لے آئے اور پھر جس کے ہاتھ جو آیا، اس نے اسی سے میرے جسم پر سیاہ نیل ڈال دیے۔ بدن پر چوٹ کے نشان نیلگوں ہوں تو انہیں نیل کہا جاتا ہے، مگر جب گھائل کا پورا جسم سیاہ پڑ جائے تو اسے کیا کہا جائے۔ میں نے بہت کوشش کی کہ انہیں بتا سکوں کہ وہ خط میری تحریر میں ضرور تھا، مگر میرا نہیں تھا، مگر کسی نے میری ایک نہ سنی۔ ”اچھا..... تو یہ تھی تمہاری ٹیوشن..... خوب عزت افزائی کروائی ہے آج ہماری، ڈوب مرو شرم سے..... عشق لڑانے سے پہلے اپنی شکل تو آئینے میں دیکھ لینی تھی۔“ جسم پر چوٹ کے ساتھ، روح پر بید کی طرح پڑنے والا اک اک طعنہ بھی کسی تازیانے کی طرح لگتا ہا۔

بہت روز تک تو میں شرم کے مارے چھت والے کمرے ہی سے باہر نہیں نکلا۔ سارے گھر والوں نے تقریباً میرا بیٹیکاٹ کر رکھا تھا۔ میں دن بھر کمرے میں بیٹھا سوچتا رہتا کہ آخر ماجد کو دیا گیا وہ رقعہ ناہید کی چھت سے کیسے برآمد ہوا۔ جانے ناہید میرے بارے میں کیا سوچتی ہوگی، اسے بھی تو باقی سب لوگوں کی طرح یہی لگا ہوگا کہ میں اسے یہ عشقیہ خط دینے کے لیے رات کو اس کی چھت ٹاپا تھا۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کس طرح ناہید تک اپنے دل کی بات پہنچاؤں کہ مجھے اپنی شکل اور اپنی اوقات کا اچھی طرح سے اندازہ ہے اور میں کبھی ایسی گستاخی کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ میرے دل میں اس کے لیے جو بھی تھا، وہ ہمیشہ کے لیے میرے دل کے کسی نازک گوشے میں پنہاں رہنے کے لیے تھا۔ پجاری کی پوجا کسی صلے کی تمنا کے لیے تو نہیں ہوتی۔ پروانے کو شمع سے موم کا دان کب چاہیے ہوتا ہے، اسے تو بس جل جانا ہوتا ہے، مجھے بھی صرف جلنے سے واسطہ تھا، روشنی کس کے حصے میں آئے، اس سے بھلا مجھے کیا غرض تھی۔ دسویں کے امتحانات میں نے بوجھل دل اور الجھے ہوئے دماغ کے ساتھ دیے اور بہ مشکل سیکنڈ ڈویژن میں پاس ہوا۔ بڑی مشکل سے ابا سے کالج میں داخلے کی اجازت ملی۔ وہ بھی اس شرط پر کہ اپنی کتابوں اور کالج کی فیس کا خرچہ میں خود برداشت کروں گا۔ میں نے سوچ رکھا تھا کہ کالج کے بعد شام کو کوئی چھوٹی موٹی نوکری یا کسی دکان پر کام پکڑ لوں گا۔ اس لیے کالج میں داخلے کی کوشش کے ساتھ ساتھ، دن بھر شہر کے چھوٹے موٹے ہوٹلوں اور پیڑول پھس وغیرہ پر کام ڈھونڈنے کے لیے بھٹکتا رہتا۔

ایسے ہی ایک دن میں کام ڈھونڈنے شہر کے پاری ہوٹلوں والی سڑک پر نکلا تو ایک لمبے کو یوں لگا، جیسے آنکھوں کو دھوکا ہوا ہے۔ میں نے آنکھیں مل کر غور سے دیکھا، تو وہ واقعی ناہید ہی تھی، شاید اسکول کی چھٹی کے بعد کسی کے ساتھ اس ریسٹورنٹ میں چائے پینے آئی تھی۔ ناہید اب دسویں جماعت کی طالبہ تھی، اور اس علاقے میں اسکول یا کالج کی طالبات کا گروپ کی شکل میں چائے پینے یا بریک میں سمو سے چٹنی کی پلیٹ اڑانے کے لیے آنا معمول کی بات تھی۔ میرا دل زور سے دھڑکا، شاید آج ہی وہ موقع تھا، جب میں ناہید سے مل کر اس کی غلط فہمی دور کر سکتا تھا۔ مگر جانے اس کے ساتھ اور کون کون ہو، اور اگر ناہید نے برا مانا یا اور غصہ کیا تو پھر.....؟؟ ایک اور تماشا نہ کھڑا ہو جائے۔ پھر تو میرے ابا کے ہاتھوں میرا خون ہونا لازمی تھا، مگر میرے پاس اور چارہ بھی کیا تھا۔ جانے پھر دوبارہ ناہید سے زندگی بھر اس طرح آنا سامنا ہو پائے یا نہیں۔ مجھے ایک کوشش تو ضرور کرنی چاہیے، آخر ناہید نے خود بھی تو مہینہ بھر مجھ سے پڑھا ہے۔ میرے بارے میں کچھ اندازہ تو اس نے بھی لگایا ہوگا، میں نے تو کبھی نظر بھر کر بھی اس کی طرف نہیں دیکھا۔ میں اپنے آپ ہی سے لڑتا، خود ہی فیصلے کر کے انہیں رد کرتا رہا اور پھر اپنے اندر کی جنگ سے گھبرا کر مزید کچھ سوچے بنا کیفے کی طرف قدم بڑھا ہی دیے۔ اندر بہت رش تھا، میں پریشان لگا ہوں سے اُسے چاروں طرف کھوج رہا تھا، اور پھر..... وہ مجھے ایک کیمین کے پردے کی اوٹ میں بیٹھی دکھائی دے گئی۔ کچھ اطمینان ہوا کہ چلو اس کے ساتھ زیادہ بھیڑ نہیں ہے، بات کرنے میں آسانی ہوگی سو، دھڑکتے دل کے ساتھ ساتھ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا کیمین کے پاس پہنچ گیا۔ ہیرا کچھ دیر پہلے

ہی چائے کے کپ میز پر سجا کر واپس پلٹا تھا۔ ناہید کسی سے بات کر رہی تھی اور اس کے سر پر اس کی سیاہ چادر ہمیشہ کی طرح سلیقے سے لگی ہوئی تھی۔ میں نے دل کڑا کر کے زور سے کھنکھار کر اپنی موجودگی کا احساس دلایا اور دھیرے سے سلام کیا۔ اس کی سہیلی ابھی تک پردے کی اوٹ میں تھی۔ ناہید نے چونک کر میری طرف دیکھا اور پھر، جیسے اس کے چہرے کا رنگ اُڑ سا گیا۔ میں نے قدم آگے بڑھایا کہ میرا مقصد اس کی بدنامی نہیں ہے۔ میں تو صرف اس کی غلط فہمی دور کرنا چاہتا ہوں، مگر کیمین میں بیٹھے دوسرے شخص کو دیکھتے ہی خود میرے حواس یک دم مختل سے ہو گئے۔ ناہید کے سامنے کوئی اور نہیں، ماجد بیٹھا تھا۔ وہی ماجد، جس نے مجھ سے ناہید کے لیے رقعہ لکھوایا تھا۔ ماجد بھی پل بھر کے لیے گھبرا گیا۔ میں تیزی سے واپس پلٹا اور کہنے سے باہر آ گیا۔ ماجد میرے پیچھے دوڑتا ہوا باہر تک آیا اور زبردستی راستے میں حائل ہو کر معذرت کرنے لگا۔ ”معاف کر دے یار پری..... میں خود تجھے بتانا چاہتا تھا، مگر ناہید نے منع کر دیا کہ فی الحال معاملہ گرم ہے۔ ذرا بات ٹھنڈی ہو جائے تو پھر..... مگر، تو نے بھی بڑا امر دوں والا کام کیا۔ تیرے ساتھ جو کچھ بھی ہوا، تو نے آخر تک زبان نہیں کھولی۔“ میرا سر تیزی سے چکرار ہا تھا۔ ناہید جانتی تھی کہ اس کی چھت پر اُس رات ماجد کو داتا تھا، پھر بھی اس نے اپنے گھر والوں سے یہ بات مٹھپائے رکھی۔ مجھے میرے گھر، محلے والوں کے سامنے اتنا رسوا کیا، سارے زمانے میں میرا تماشا بنا دیا۔ میرا سر گھوم رہا تھا، میں نے بہ مشکل ماجد سے سوال کیا۔ ”تو کیا وہ خط تم نے ناہید ہی کے لیے لکھوایا تھا؟“ ”ہاں یار! اُسی کو دینا تھا۔ ایک دن اس نے میرے سامنے تمہاری لکھائی کی تعریف کی، تو میں نے بھی اس سے شرط لگائی کہ تمہارے ہی ہاتھ سے خط لکھوا کر اُسے دوں گا۔“ میں نے حیرت سے ماجد کو دیکھا۔ ”مگر تم تو ہر وقت یہی کہتے تھے کہ وہ تمہیں کبھی گھاس تک نہیں ڈالتی.....“ ماجد نے کھسیا کر قہقہہ لگایا۔ ”وہ سب بھی میں ناہید کے کہنے ہی پہ کہتا تھا، ٹو نہیں جانتا یار۔ یہ لڑکیاں ہم بے وقوف لڑکوں سے کہیں زیادہ تیز ہوتی ہیں۔ بڑا دماغ چلتا ہے، ان کا ایسے معاملات میں، دراصل وہ کسی بھی طرح کی بدنامی مول نہیں لینا چاہتی تھی۔ آج بھی بڑی مشکل سے اسے چائے کے ایک کپ کے لیے راضی کیا تھا۔ پر ٹو نے آکر سارا معاملہ بگاڑ دیا۔“ میرا ذہن سائیں سائیں کر رہا تھا۔ ماجد اپنی دھن میں نہ جانے کیا کچھ بولتا رہا۔ اتنے میں کہنے کا ایک ہیرا باہر آیا اور ماجد سے بولا۔ ”آپ کو اندر بلارہی ہیں۔ کہتی ہیں، مہمان کو بھی ساتھ لے آئیں، ضروری بات کرنی ہے۔“ میں نے لاکھ دامن چھڑانے کی کوشش کی، مگر ماجد مجھے تقریباً کھینچتا ہوا اندر کہنے میں لے گیا۔ ناہید سر جھکائے بیٹھی تھی۔ مجھے اندر آتے دیکھ کر دھیرے سے بولی۔ ”امید ہے آپ نے ہم دونوں کو معاف کر دیا ہوگا۔ ہم دونوں کی وجہ سے آپ کو جو تکلیف پہنچی، ہم اس کے لیے معذرت خواہ ہیں۔ میں خود آپ سے مل کر آپ کو ساری بات بتانا چاہتی تھی، مگر حالات ایسے بڑے کہ میں کچھ نہ کر سکی۔“ میں چپ چاپ بیٹھا اس کی بات سنتا رہا۔ اس سے یہ بھی نہ کہہ سکا کہ کم از کم مجھے تو بچ بتا دیتی۔ ناہید نے اپنی بات جاری رکھی۔ ”دراصل میں چاہتی تھی کہ جب تک ماجد کے گھر سے میرے لیے باقاعدہ رشتہ نہیں آ جاتا، تب تک کسی کو بھی ہمارے بارے میں ذرا سا بھی شک نہ ہو۔ آپ تو باہجی کے غصے سے واقف ہیں ناں۔ اس رات بھی ماجد کی ایک ذرا سی غلطی سے یہ سارا ہنگامہ کھڑا ہو گیا اور ہمیں پتا ہی نہیں چلا کہ آپ کا لکھا وہ رقعہ کب اور کیسے گھبراہٹ میں وہیں گر گیا۔“ ناہید کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گئی۔ کچھ لوگ جب بولتے بولتے خاموش ہو جاتیں تو ان کی خاموشی بولنے لگتی ہے۔ مگر مجھے آج اس کی یہ خاموشی بہت گراں گزر رہی تھی۔ ”دراصل میں بہت ڈر گئی تھی، اسی لیے جب اتانے آپ کی تحریر دیکھ کر آپ پر شک کیا، تو میں چپ رہی۔ کیوں کہ میں اگر ماجد یا کسی اور کا نام لیتی تو انہیں مجھ پر بھی شک ہو سکتا تھا کہ میں بھی اس کے ساتھ شامل ہوں، صرف ایک آپ ہی ایسے تھے، جن کے نام کے ساتھ میرا نام نہیں جوڑا جاسکتا تھا۔ مطلب کسی کو بھی مجھ پر شک نہیں ہو سکتا تھا کہ میں بھی آپ کو پسند کر سکتی ہوں۔“ میں نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا اور وہ بولتے بولتے چپ ہو گئی۔ میرے اندر بہ یک وقت کئی شے چکنا چک رہو گئے اور میں ننگے پاؤں ان کرجیوں پر چلتا ہوا وہاں سے اٹھ آیا۔

پتا نہیں، میں نے اُس روز گھر تک کا راستہ کیسے طے کیا۔ میرے آس پاس تیز ٹریفک کا شور، گاڑیوں کے ہارن اور لوگوں کی آوازوں کی بھرمار تھی، مگر میں جیسے ساری دنیا سے لاطعلق اور بیگانہ سا ان راستوں پر چلتا رہا، شاید ہمارے قدم کچھ راستوں پر چل چل کر اتنے راستہ آشنا ہو چکے ہوتے ہیں کہ دل اور دماغ بند ہونے کی صورت میں بھی وہ ہر موڑ پہچان لیتے ہیں، ورنہ اس وقت میری جو حالت تھی مجھے ضرور کسی ویرانے میں بھٹک جانا چاہیے تھا، ٹھیک ہی تو کہہ رہی تھی وہ..... کوئی اندھا ہی ہوگا جو ناہید پر مجھ سے کوئی بھی تعلق جوڑنے کا شک کرے گا۔ کہاں وہ اور کہاں میں؟ اس نے کتنی آسانی سے یہ بات کہہ دی۔ بعض حقائق ہم پر پہلے دن ہی سے روز روشن کی طرح عیاں ہوتے ہیں، مگر پھر بھی کسی کی زبان سے ان کی تشریح ہمیں کس قدر سوگوار کر دیتی ہے، ہم کم زور انسان اپنے اندر اتنی خود فریبیاں کیوں پالے رکھتے ہیں؟ شاید اسی لیے انسان اپنی پیدائش سے لے موت تک جانے کتنی بار ٹوٹتا ہے، مگر ناہید کی پسند ماجد بھی کیسے ہو سکتا ہے۔ محلہ ماجد کے قصوں سے واقف تھا، مگر پھر بھی ناہید.....؟ میرا ذہن سُن ہو گیا تھا۔ مطلب یہ ہوا انسان کی ظاہری شخصیت ہی آخر کار فتح یاب ہوتی ہے۔ یہ اندر کی خوب صورتی، دل کی سچائی وغیرہ جیسی فضول کتابی باتیں ہمیشہ کی طرح ایک بار پھر بیکسر غلط ثابت ہو گئی تھیں۔ شاید یہ ساری کتابی کجرامر مجھ جیسے پری زادوں کی تسلی کے لیے ہی تھی۔

میرا داخلہ ایک سرکاری کالج میں ہو چکا تھا، مگر دل کالج جانے پر آمادہ ہی نہیں ہو رہا تھا۔ دسویں جماعت تک ایک ہی اسکول میں پڑھتے پڑھتے سارے استاد اور طالب علم میرے نام اور صورت کے تضاد کے عادی ہو چکے تھے اور انہوں نے میری بد صورتی کو کسی حد تک قبول کر لیا تھا، مگر کالج جاتے ہی یہ ساری بحث ایک بار پھر سے تازہ ہو گئی۔ بہت دنوں تک کلاس میں، کینٹین میں اور کالج کی راہ داریوں میں مجھے پھر سے اسی تجربے سے گزرنا پڑا، وہی طنز بھری مسکراہٹ، جملے اور تحاریر بھری مثالیں۔ میرا جواب ہمیشہ کی طرح خاموشی ہی تھا، کیوں کہ میں جانتا تھا کہ مجھے اس چھلنی سے بار بار چھننا ہوگا۔ ان ہی دنوں میری ملاقات فورتحہ ایئر کے ناساز سے ہوئی۔ دراصل اس سے پہلا تعارف بھی اس کے اس عجیب و غریب تخلص کی وجہ سے ہوا تھا۔ اس کا پورا نام جمیل احمد تھا، مگر وہ خود کو ناساز کہلوانا پسند کرتا تھا۔ ایک دن میں راہ داری سے گزر رہا تھا کہ کسی سینئر طالب علم نے زور سے اس کا نام پکارا۔ ”اے او

ناساز..... تیری پھر سے تین سہیلیاں آئی ہیں۔ مطلب تو اگلے سال بھی اسی کالج کے لکڑی کی روٹیاں توڑے گا۔“ ناساز کے باقی دوست بھی ہنس پڑے۔ ناساز نے ہاتھ میں پکڑے سگریٹ کی راکھ جھاڑی اور ایک بھر پور کش لے کر دھواں فضا میں اڑا دیا۔ ”وہ طفل کیا کریں گے جو گھٹنوں کے بل چلے.....“ پتا چلا کہ گزشتہ تین چار سال سے ناساز چوتھے سال ہی میں انکا ہوا ہے۔ نہ اسے پاس ہونے کی جلدی تھی، نہ ہی کالج والے اسے نکالنے پر آمادہ، کیوں کہ وہ کالج کی ادبی سوسائٹی کا صدر تھا اور اس کی صدارت میں کالج بہت سی ٹرائیاں اور کپ جیت چکا تھا۔ وہ ایک بہترین مقرر، شاعر اور افسانہ نگار تھا۔ اگلی صبح میں کالج کے گیٹ سے اندر داخل ہوا تو ناساز گیٹ کے قریب ہی بے چینی سے ٹہل رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے اشارے سے اپنے قریب بلایا۔ ”بات سنو لڑکے.....“ میں جھجکتا ہوا اس کے قریب پہنچا۔ ”سگریٹ پیٹے ہو؟“ میں نے انکار میں سر ہلایا۔ وہ بے زاری سے بولا۔ ”پھر کیا خاک جیتے ہو.....“ میری جیب میں اس وقت شام کی ٹیوشن سے ملنے والے چند روپے پڑے تھے۔ میں سیدھا وہاں سے کینٹین گیا اور سب سے بہتر برانڈ کی ایک ڈبیا اور ماچس لے کر دوبارہ ناساز کے پاس آیا اور سگریٹ اور ماچس اس کی ہتھیلی پر رکھ دیے۔ وہ سگریٹ دیکھ کر چونک سا گیا۔ اس نے جلدی سے سگریٹ سلا کر دو چار بھر پور کش لگائے اور میں نے پہلی مرتبہ کٹوٹھن کو اپنے سامنے بیٹھے شخص کی رگوں میں پوری طرح سرایت ہوتے ہوئے محسوس کیا۔ اس نے مزید چند کش لیے تو میں پلٹ کر جانے لگا۔ ناساز نے جلدی سے مجھے آواز دے کر روکا اور غور سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”پیسے تھے تمہارے پاس.....؟“ ”ہاں! کرائے کے پیسے تھے، جو آج تمہارے کام آگئے۔“ وہ زور سے ہنسا اور ہاتھ بڑھا کر بولا۔ ”مجھے ناساز کہتے ہیں۔ میں اپنا تخلص ناشادرکھنا چاہتا تھا، مگر پتا چلا کہ میرے حق پر پہلے ہی کوئی موسیقار ڈاکا ڈال گیا ہے۔ تمہارا نام کیا ہے.....؟“ میں نے انکلتے ہوئے اپنا نام بتایا۔ ”پری زاڈ“..... ناساز نے زور سے ”واہ“ کہا۔ ”نام تو بڑا شاعرانہ رکھا ہے پیارے..... زندگی میں پہلی مرتبہ مجھے کسی کے لہجے اور نظر میں اپنا نام سن کر طنز اور تمسخر کی جھلک نہیں دکھائی دی۔ یہ میری اور ناساز کی دوستی کی ابتدا تھی۔ میری زندگی کا پہلا دوست، جس سے بات کرتے ہوئے میری زبان لڑکھائی نہیں تھی، نہ ہی مجھے ٹھنڈے پسینے آئے تھے۔ سگریٹ اس کی زندگی کا ایک ایسا لازمی جزو تھا کہ کبھی کبھی مجھے یوں محسوس ہونے لگتا جیسے ناساز سگریٹ کو نہیں، سگریٹ دھیرے دھیرے ناساز کو پی رہی ہو، نگل رہی ہو۔ وہ مجھ سے عمر میں پانچ چھ سال ہی بڑا تھا، مگر اپنی باتوں سے کوئی بوڑھی روح دکھائی دیتا تھا۔

چند ہفتوں بعد شہر کے تمام مردانہ اور زنانہ کالجنوں کے درمیان تقریری مقابلے ہوئے تو ناساز کا جادو سرچڑھ کر بولنے لگا۔ میں ایسی تقریبات میں جانے سے حتی الامکان گریز کرتا تھا، مگر وہ فائنل مقابلے کی تقریب میں مجھے کسی طرح زبردستی پکڑ کر لے گیا۔ ہال میں ایک جانب ہمارے کالج کے لڑکوں کی نشستیں تھیں اور دوسری جانب لڑکیوں کے کالج کی طالبات بیٹھی اپنی کالج کی مقررات کی حوصلہ افزائی کے لیے شور مچا رہی تھیں۔ میں ایک کونے میں سکر کر بیٹھا رہا، ناساز نے اپنی دھواں دار تقریروں سے ماحول گرمادیا، مگر نہ جانے آخری مرحلے پر وہ پسپا کیوں ہو گیا اور لڑکی نے پہلا انعام جیت لیا۔ میں نے باہر نکلتے ہی اس سے براہ راست اپنے اس خدشے کا اظہار کر دیا کہ وہ جان بوجھ کر ہار رہا ہے۔ ناساز دھیرے سے مسکرایا۔ ”تم اگر دھیان سے دیکھتے تو تمہیں پتا چلتا کہ میں جیت گیا ہوں۔ زندگی میں ہر بازی اول اور دوم نمبر سے نہیں ٹاپی جاتی۔“ پھر اس نے مجھے غور سے دیکھا۔ ”تم نے کبھی کسی سے محبت کی ہے پری زاڈ.....؟“ ”پل بھر کے لیے مجھے یوں محسوس ہوا کہ ناساز بھی باقی سب لوگوں کی طرح میرا مذاق اڑا رہا ہے، مگر مجھے اس کی آنکھوں میں اس کے سوال کی سچائی دکھائی دی۔ میں نے سر جھکا کر دھیرے سے جواب دیا۔ ”مجھ سے بھلا کون محبت کرے گی.....؟“ ”کیوں..... تم سے محبت کیوں نہیں کی جاسکتی.....؟“ میں چپ رہا۔ ناساز سمجھ گیا اور بات بدل کر بولا۔ ”شاعری پڑھتے ہو.....؟“ ”ہاں، مگر مجھے شعر یاد نہیں رہتے۔“ ناساز نے نصیحت کی۔ ”شعرا یاد رکھا کرو، صنف نازک پر بڑا اچھا اثر پڑتا ہے اچھے شعروں کا.....“ پھر کچھ سوچ کر بولا۔ ”منیر نیازی کو پڑھا کرو..... اور اس کی ایک نظم تو زبانی یاد کر لو۔“ ہمیشہ دیر کر دیتا ہوں میں..... ضروری بات کہنی ہو..... کوئی وعدہ نبھانا ہو، اسے آواز دینی ہو..... اسے واپس بلانا ہو..... ہمیشہ دیر کر دیتا ہوں میں..... کسی کو موت سے پہلے..... کسی غم سے بچانا ہو..... حقیقت اور تھی کچھ، اس کو جا کر بتانا ہو..... ہمیشہ دیر کر دیتا ہوں میں.....“ میں نے جلدی جلدی ساری نظم اپنی کاپی میں نوٹ کر لی اور اسی وقت اس کا رنجا بھی لگا لیا۔ ”بس..... اب یاد رکھنا کہ تمہیں اپنی گفتگو کے دوران کسی نہ کسی بہانے یہ نظم دہرائی ہے۔ میں تمہیں چند اور اثر انگیز غزلیں اور نظمیں بھی یاد کروادوں گا۔ کیا سمجھے.....؟“ میں نے جلدی سے کسی بچے کی طرح سر ہلایا۔ مجھے یاد آیا کہ ناہید کو بھی شعرو شاعری سے کافی گہرا لگاؤ تھا اور شاید ماجد کو بھی بہت سے شعرا یاد تھے۔ ناہید کا خیال آتے ہی میرے گال پر شدید جلن کا ایک احساس ہوا۔

اگلے چند دنوں میں ناساز نے مجھے بہت سی نظمیں یاد کروا دیں اور پھر جس دن میں نے بزم ادب کے پیریڈ میں کھڑے ہو کر ”محبت اب نہیں ہوگی..... یہ کچھ دن بعد میں ہوگی..... گزر جائیں گے جب یہ دن..... یہ ان کی یاد میں ہوگی“ سنائی تو پہلی مرتبہ کلاس کے لڑکوں نے دل سے میرے لیے تالیاں بجائیں اور استاد نے بھی مجھے زندگی میں پہلی مرتبہ شاباش دی۔ ناساز کی کبھی بات سچ ثابت ہو رہی تھی۔ لوگ میری بات غور سے سننے لگے تھے۔ میرے دل میں ایک عجیب سی خواہش انگڑائیاں لینے لگی کہ کبھی کالج میں پہلے کی طرح لڑکے اور لڑکیوں کے اداروں کا مقابلہ ہو اور میں بھی اسٹیج پر جا کر ناساز کی طرح کچھ پڑھوں، میں نے سارے بڑے شعراء کو تقریباً حفظ کر لیا..... اور مجھے کالج کی بزم ادب کی ٹیم میں بھی شامل کر لیا گیا تھا۔ اس کوشش میں میرے اندر بھی جھوٹا سہمی، مگر ایک جھوٹا مونا شاعر پلنے لگا تھا۔ میری باتوں میں شاعری کا رنگ جھلکنے لگا۔ ناساز کسی مجھے ہوئے استاد کی طرح میری ”شاعرانہ تربیت“ کر رہا تھا، وہ کہیں سے بھی اچانک نازل ہو جاتا۔ ”یہ کیا غالب اور میر کے رتنے لگاتے رہتے ہو۔ آج کل کی لڑکیاں اتنی مشکل شاعری بھلا کب سمجھتی ہیں۔ احمد فراز کو پڑھا کرو، اور ہاں..... کبھی کبھی ساحر لدھیانوی کو دہرانے میں بھی کوئی حرج نہیں ہے۔ ساحر کو تو جانتے ہونا..... میں ”پل دوپل کا شاعر ہوں..... پل دوپل میری کہانی ہے“ والا..... اور ہاں..... کل سے تمہیں یہ دہراتے رہنا ہے۔“ میں اور میری تنہائی..... اکثر یہ باتیں کرتے ہیں..... تم ہوتیں تو کیسا ہوتا..... تم اس پر کتنا حیراں ہوتیں.....“ میں دبے لفظوں میں ناساز کو یہ سمجھانے کی کوشش کرتا کہ جس کسی ایک کے لیے وہ مجھ سے یہ ساری مشق کر رہا ہے، اس ”ایک“ کا تو میری زندگی میں کوئی وجود ہی نہیں۔ پھر یہ تیاری کس کام کی؟ مگر ناساز بھلا میری کب سنتا تھا۔ ایک دن کالج سے واپسی کے راستے پر وہ میری اسی تربیت میں مصروف تھا کہ میری نظر پرانے کباڑیے کی دکان کے میا لے شیشے سے اندر پڑی اور میرے قدم وہیں جم کر رہ گئے۔ اندر ایک پرانا پیا نو پڑا تھا۔ کباڑیے نے میری دل چسپی محسوس کی تو جلدی سے بولا۔ ”خالص شیشم کی لکڑی کا ہے۔ انگریز کے پرانے کلب سے خریدا ہے۔ خریدو گے۔ صرف تیرہ ہزار میں دے دوں گا۔“ میں نے اپنی جیب دیکھی، دو سو سی روپے پڑے تھے، میں نے دھیرے سے کباڑیے سے کہا۔ ”ایک دن ضرور خریدوں گا.....“ ہم دونوں آگے بڑھ گئے۔ میں تھکے ہارے قدموں سے گھر واپس پہنچا تو صحن میں داخل ہوتے ہی ایک جھٹکے سے رک گیا۔ صحن میں ناہید کی امی کھڑی میری اماں سے کچھ بات کر رہی تھیں۔ ان دونوں نے قدموں کی آوازن کر میری طرف دیکھا۔

(جاری ہے)

ہاشم ندیم نوجوان نسل کے پسندیدہ، مُلک کے معروف و منفرد ڈراما رائٹر، ناول نگار ہیں۔ ان کے ناول ”خدا اور محبت“ اور ”بچپن کا دبیر“ نے بین الاقوامی پذیرائی حاصل کی، تو جنگ، سنڈے میگزین میں شائع ہونے والے ناول ”عبداللہ“ کو بھی وقت کے پسندیدہ ترین ناول کا درجہ حاصل ہوا۔ انہیں ان کی ادبی خدمات پر حکومت پاکستان نے تمغہ حسن کارکردگی سے نوازا۔ نیز، فلم کے شعبے میں ”عبداللہ“ نامی ایک بین الاقوامی فلم کے تخلیق کار کی حیثیت سے بھی قدم رکھ چکے ہیں۔

”پری زاد“ ایک اچھوتے، حسّاس اور قدرے مشکل موضوع پر مبنی بہت دل گداز سی تحریر ہے، یہ ایک ایسے شخص کی کھتا ہے، جسے اک کم صورتی کے عیب کے سبب، اس ظاہر پسند، زر پرست دنیا کے اُن گنت بد صورت رویوں، بد ہیئت آئینوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ناول سے متعلق اپنی آراء سے آگاہ کرنا ہرگز مت بھولے گا۔ ہمارا پتا وہی پرانا ہے:

ایڈیٹر، ”سنڈے میگزین“ روزنامہ جنگ، شعبہ میگزین، اخبار منزل، آئی آئی چندر نگر روڈ، کراچی۔ ای میل:
sundaymagazine@janggroup.com.pk

ناہید کی امی نے مجھے دیکھ کر برا سامنہ بنایا اور اماں کو تاکید کرتی ہوئی گھر سے نکل گئیں۔ ”اے بہن آنا ضرور..... ہم لوگ زیادہ عرصے تک ناراضیاں پالنے کے شوقین نہیں۔“ ان کے جانے کے بعد بُرا منہ بنانے کی باری اماں کی تھی۔ ناہید اور ماجد کی بات طے ہو گئی، انہی کی متگنی کا پیغام دینے آئی تھی یا شاید یہ جتانے کے لیے کہ تیری اس حرکت کے بعد بھی ان کی لاڈلی کے لیے محلے کے سب سے بڑے گھر سے رشتہ آیا ہے۔ تُو نے تو ہمیں کہیں کا نہیں چھوڑا پری زاد.....“ میں اماں کی بڑ بڑاہٹ نظر انداز کرتا اوپر کمرے کی جانب بڑھ گیا۔ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ ایک دن یہ ہونا ہے، مگر پھر بھی نہ جانے کیوں ناہید کے رشتے کی خبر سن کر دل بھج سا گیا تھا۔ اگلے روز کالج میں ناساز نے میری یہ کیفیت بھانپ لی۔ ”کیا بات ہے پیارے! آج کچھ کچھ سے دکھائی دے رہے ہو؟“ میں نے قریب پڑا کنکر اٹھا کر ڈورتالاب کی طرف پھینکا۔ ”تو اس سے پہلے تم نے مجھے کب جلتے یا جگمگاتے دیکھا ہے؟“ وہ میرے قریب آ کر بیٹھ گیا۔ ”جل تو رہے ہو اور بڑی شدت سے جل رہے ہو، مگر یہ جلن اندر ہی اندر رکھ کر دینے والی ہے۔ بتاؤ گے نہیں، کب سے سلگ رہے ہو؟“ میں نے اسے ناہید والی ساری بات بتادی۔ ناساز نے سُن کر ایک سردی آہ بھری، پھر کسی بزرگ کی طرح بیٹھ کر مجھ سے عہد لینے لگا۔ ”تم مجھ سے ایک وعدہ کرو، آج کے بعد اپنے اندر لگی اس آگ کو کبھی بجھنے نہیں دو گے کہ یہ جیون اس سُن کی مار کے بغیر صرف ایک سرد خانہ، ایک بوجھ ہوتا ہے۔ اس لیے بندے کے اندر یہ سلگن لگی رہنی چاہیے۔ انسان سے بھی بڑے بڑے کارنامے کروا جاتی ہے یہ تڑپ، یہ جلن..... عام طور پر، آدمی گیلی تیلی کی طرح ساری عمر سِلن سے بھری خم زندگی گزار دیتا ہے، مگر جلنے کے لیے ماچس کی رگڑ میسر نہیں آتی۔ اس لڑکی سے ناکام محبت نے تمہیں وہی رگڑ دے دی ہے، اب جل گئے ہو، تو خود کو بجھنے مت دینا۔“ اُس وقت مجھے ناساز کی بات ٹھیک طرح سمجھ نہیں آئی، مگر اس نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ جب مقدمہ میں آخر کار فنا ہونا ہی لکھا ہے، تو پھر یہ کُجھ اُجھ اور سلگ سلگ کر جینا کیسا؟ تیز بھڑکتے شعلے کی طرح جل کر راکھ ہو جانے ہی میں مزہ ہے۔ میں بھی اُس روز کے بعد کُجھ ایسا جلا کہ اندر سب کُجھ بھسم ہو گیا۔ بس میں، میری کتابیں، میری چھت اور آسمان پر رات کو چمکتے میرے دوست ستارے، یہی کُجھ باقی رہ گیا تھا زندگی میں۔

اگلے سال کالج والوں نے رحم کھا کر ناساز کو سند دے ہی دی، تو وہ اپنے گاؤں واپس جانے سے پہلے مجھ سے لپٹ کر رو پڑا۔ ”اپنا خیال رکھنا اور مجھے بھول مت جانا“ میں بھیگی پلکوں کے ساتھ اسٹیشن پر اس کی گاڑی کو چھوٹنے دیکھتا رہا اور پھر، بوجھل قدموں کے ساتھ گھر واپس آ گیا۔ کالج کے فائنل ایئر سے قبل ہی، پہلے ابا اور پھر اماں یکے بعد دیگرے چل بے، پر مجھے پہلی باریقی کا احساس اُس وقت ہوا، جب بھائی بھائیوں نے گھر کے خرچے میں ہاتھ بنانے کا حکم صادر کر دیا۔ ان سب کی خواہش تھی کہ میں یونیورسٹی میں داخلے کا ارادہ ترک کر کے کہیں کلرک یا چڑاسی کی نوکری پکڑ لوں تاکہ میرا بوجھ ان کے کاندھوں سے ہٹ جائے۔ مگر میں نے کسی نہ کسی طرح انہیں قائل کر ہی لیا کہ کسی سرکاری نوکری کے ملنے ہی میں تعلیم کا سلسلہ ترک کر دوں گا۔ تب تک شام سے رات تک تین چار ٹیوشنز پڑھا کر گھر کا خرچہ بانٹ سکتا ہوں۔ میں اب وہ پہلے والا ناکام اور نالائق طالب علم نہیں تھا۔ ناساز کی لگائی آگ کی بھٹی میں عِب کر لندن ہو چکا تھا۔ کالج میں بھی فائنل میں، میری تیسری پوزیشن آئی تھی۔ تعلیمی ادارے مجھے فخر سے اپنے ادبی پروگراموں اور مشاعروں میں مدعو کرتے تھے۔ میرا نام ایک اُبھرتے ہوئے نوجوان شاعر کے طور پر شہر کے گلی کوچوں میں پھیل رہا تھا، لوگ میری سوچ اور لفظوں کی مدح سرائی کرتے تھے، ہاں اگر کُجھ نہیں بدلاتھا تو میری صورت دیکھتے ہی لوگوں کا وہ بے اختیار تاثر، البتہ اب لوگوں کے رویے میں اتنی منافقت ضرور آ گئی تھی کہ بچپن میں وہ میرے منہ ہی پر ہنس دیتے تھے، مگر اب قہقہہ میرے پلٹ جانے کے بعد چھوٹا۔ اپنے ڈیپارٹمنٹ کی تعارفی کلاس میں بھی، جب مجھے لیکچر ہال کے ڈائس پر بلایا گیا، تو آس پاس سے ہلکی ہلکی سرگوشیاں بلند ہونے لگیں۔ ”ارے! تو یہ ہے پری زاد.....“ ”آئے ہائے..... سارا مزہ کر کر کر دیا“ ”شاعری تو غضب کی کرتا ہے، مگر شخصیت..... تو بد تو ہے.....“ ”نہیں نہیں، یہ پری زاد نہیں ہو سکتا، یہ تو کسی فیکٹری کا فورمین لگتا ہے۔“ میں یہ ساری سرگوشیاں اور فقرے سُنتے ہوئے ان کے درمیان سے چلتا ڈائس پر آ گیا۔ کلاس پر ایک سکوت طاری تھا۔ میں نے اپنا نام بتانے کے بعد کسی لمبی چوڑی تمہید کے بجائے صرف تین مصرعوں پر اکتفا کیا۔ ”قصے میری الفت کے جو مرقوم ہیں سارے..... آدیکھ تیرے نام سے موسوم ہیں سارے..... شاید یہ ظرف ہے، جو خاموش ہوں اب تک..... ورنہ تو تیرے عیب بھی معلوم ہیں سارے..... سب جرم میری ذات سے منسوب ہیں محسن..... کیا میرے سوا اس شہر میں معصوم ہیں

سارے.....؟ اور بس، میں اپنی بات ختم کر کے ڈاکس سے اتر آیا، گزرتے دنوں کے ساتھ میری کلاس نے بھی میری بد صورتی سے سمجھوتا کر لیا، مگر میں خود اپنے اس بے چین اور بے قرار دل کا کیا کرتا؟ کبھی کبھی تو مَن کرتا کہ کوئی تیز دھار خنجر لے کر اپنا سینہ چیر ڈالوں اور خود اپنے ہاتھوں سے یہ روگی دل نکال کر اس کے اتنے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کروں کہ پھر کبھی کوئی کلزا سینے میں جڑنے نہ پائے، مگر پھر میرا سدا کا نادان دل مجھ سے سوال کرتا کہ آخر اس کی خطائی کیا تھی۔ صرف اتنی کہ کوئی اسے بھی کبھی اک پیار بھری نظر سے دیکھ لے، صرف ایک نظر..... جو صرف میرے لیے ہو۔ میرا اس ایک نظر کے لیے ہر احساس، بالکل پاک تھا۔ مجھے تو بس ایک لمحہ ہی ساری زندگی کے بدلے درکار تھا۔ ایک پل، جب کوئی مجھے اپنا مان لے۔ کیا یہ خواہش، یہ تمنا اتنی ہی مشکل اور ناجائز تھی کہ میں اس کے اپنے اندر جاگ اٹھنے ہی پر ساری زندگی خود کو ملامت کرتا ہوں۔ آخر یہ دنیا ایسی ہر نظر، خوب روؤں کے لیے کیوں بچا رکھتی ہے، کیا مجھ جیسوں کے لیے کسی کے کشکول میں ایسی ایک نظر کی بھیک بھی نہیں۔

اُس روز بھی میں یونیورسٹی کی ایک سنسان راہ داری سے گزرتے ہوئے کچھ ایسے ہی بے سرو پا خیالات کی یلغار کا شکار تھا کہ اچانک اپنے عقب میں کسی لڑکے کی آواز سنائی دی۔ ”مسٹر پری زاد.....“ میں نے رُک کر دیکھا، انگریزی ڈیپارٹمنٹ کا ایک ہینڈ سائز کا حتام اپنے دو، تین کلاس فیلوز کے ساتھ میری جانب بڑھ رہا تھا، جن میں شعلہ جوالا قسم کی ایک لڑکی بھی تھی۔ ”آپ اردو ڈیپارٹمنٹ کے پری زاد ہیں ناں، میرا نام حتام ہے، یہ باسط اور یہ ہماری دوست لبتی۔ ہم تینوں انگلش ڈیپارٹمنٹ سے ہیں۔“ ”جی فرمائیے.....“ میں نے کہا تو حتام کے بجائے لبتی بولی۔ ”دراصل ہمیں آپ کی مدد چاہیے۔ ہم شیکسپیر کا پلے، پرفارم کرنا چاہتے ہیں، مگر ہمیں اجازت اسی صورت ملی ہے کہ ڈرامے کا ایک شوار دو ترجمے کے ساتھ بھی پیش کیا جائے۔ کیا آپ ہمارے لیے ڈرامے کا ترجمہ کر دیں گے.....؟“ میں نے ان تینوں کے متجسس چہروں پر نظر ڈالی۔ ”کوشش کروں گا کہ کر پاؤں۔ ویسے کس ڈرامے کا ترجمہ کرنا ہے۔“ وہ تینوں خوش ہو گئے اور باسط جلدی سے بولا۔ ”اوتھیلو (OTHELO)۔“ ”ٹھیک ہے، آپ لوگ تین چار دن کی مہلت دیں۔ میں ترجمہ کر کے آپ لوگوں کو بتا دوں گا۔“ ان تینوں نے خوش ہو کر نعرہ لگایا۔ ”گریٹ“ اور جاتے وقت بڑے پُر جوش انداز سے ہاتھ ملایا۔ لبتی سے ہاتھ ملاتے ہوئے میں نے بڑی مشکل سے اپنے ہاتھ کی لرزش پر قابو پایا۔ تیسرے دن میں ترجمے کا پہلا ڈرافٹ لے کر انگلش ڈیپارٹمنٹ میں حتام گروپ کی تلاش میں نکلا تو پتا چلا کہ سارا گروپ آڈیو ریم میں ڈرامے کی ریہرسل میں مصروف ہے، میں چپ چاپ ہال میں داخل ہو کر آخری نشستوں پر بیٹھ گیا۔ ہال میں ملگجی سی نامکمل روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ صرف سامنے ہال کے اسٹیج پر تیز لائٹس تھیں۔ سب ہی اداکاری کے بہترین جوہر دکھا رہے تھے، مگر لبتی کی اداکاری الگ ہی تھی۔ وہ بہت ڈوب کر مکالمے ادا کر رہی تھی اور سارا گروپ تھوڑی تھوڑی دیر بعد اسے خوب جم کر داد بھی دے رہا تھا۔ لبتی ایک منجھی ہوئی اداکارہ کی طرح آخری سین میں ہیروئن کی موت کا منظر پیش کر رہی تھی۔ میں خود اس کی اداکاری میں اس قدر کھو چکا تھا کہ جب اس نے آخری سانس لے کر سر ڈھلکایا تو بے اختیار ہی اپنی جگہ پر کھڑے ہو کر تالیاں بجانے پر مجبور ہو گیا۔ سب نے چونک کر مجھے دیکھا اور زور سے چلائے۔ ”ارے..... تم ہو پری زاد..... آؤ، اسٹیج پر آ جاؤ.....“ حتام نے باقی لوگوں سے میرا تعارف کراتے ہوئے بتایا کہ میں اس ڈرامے کا اردو ترجمہ کرنے والا ہوں۔ میں نے لبتی کو اس کی اداکاری کی داد دی تو وہ سر جھٹک کر بولی۔ ”نہیں، ابھی میں پوری طرح سے خود کو کردار میں ڈھال نہیں پارہی۔ میرا خیال ہے کہ جب ہیروئن کی موت ہو تو اُس وقت کچھ اشعار یا کوئی غم گین نظم ضرور اور لپ ہوئی چاہیے..... تب ہم بھینا پورے ہال کو رونے پر مجبور کر دیں گے۔“ انگریزی ڈیپارٹمنٹ کے باقی کچھ طلبہ، جو اس ڈرامے میں حصہ لے رہے تھے، مجھے اس طرح دیکھ رہے تھے، جیسے میں کوئی عجوبہ ہوں۔ وہ سب کے سب اونچے گھرانوں کے چشم و چراغ تھے۔ ان کے قیمتی لباس، کلون اور پرفیوم کی مہک، ہاتھوں میں پہنی قیمتی گھڑیاں، بر سیلٹس اور ایک جانب بے پروائی سے پھینکے گئے مہنگے بیگز اور جینز جیکٹس، میری سادہ سفید شرٹ اور پانچ سال پرانی گھسی ہوئی پتلون سے بالکل بھی میل نہیں کھا رہے تھے۔ دراصل امداد کی بھی اپنی ایک خاص چکا چوند ہوتی ہے، جسے کسی تشریح کی ضرورت نہیں پڑتی اور غربت..... سات پردوں میں بھی چھپی ہو تو، شناخت چھپائے نہیں چھپتی۔ لبتی کی کچھ انگریزی میڈیم سہیلیوں نے اسے گہنی مار کر کچھ کہا اور سب زور سے ہنس پڑیں۔ لبتی نے مجھ سے نظر بچا کر ان سب کو انگریزی میں ڈانٹا اور اپنے رویے پر قابو پانے کی ہدایت کی۔ میں نے لبتی کو بتایا کہ میں نے اوتھیلو کا ترجمہ کر لیا ہے اور اگر وہ لوگ چاہیں تو کل ہی سے اردو ڈرامے کی بھی ریہرسل شروع کر سکتے ہیں۔ حتام نے مجھے بھی ریہرسل دیکھنے کے لیے آنے کی درخواست کی تاکہ میں ان کے تلفظ کی جانچ بھی کر سکوں۔ ہاں، زندگی کی دوڑ میں ہم اردو میڈیم والوں کے پاس آخر میں صرف یہی ایک تلفظ ہی تو باقی رہ جاتا ہے۔

رات کو جب میں گھلی چھت پر تاروں کی اوڑھنی کے نیچے لیٹا، ڈرامے کے بارے میں سوچ رہا تھا، تو مجھے لبتی کی بات یاد آ گئی کہ اگر لڑکی کی موت کے پس منظر میں کوئی درد انگیزی نظم ہو تو تاثر دو بالا ہو جائے گا۔ ”اوتھیلو“ کے اختتام پر ہیرو کسی رقیب کی لگائی ہوئی شک کی آگ میں جھلس کر خود اپنے ہاتھوں سے ہیروئن کو لگا دبا کر مار دیتا ہے اور پل بھر کی نفرت کا غلبہ ساری عمر کی محبت کو نگل جاتا ہے۔ مجھے یہ بات کبھی سمجھ نہیں آتی تھی کہ انسان کی برسوں کی محبت کا امرت گھڑی بھر میں نفرت کے کڑوے زہر میں کیسے تبدیل ہو جاتا ہے؟ یا پھر شاید محبت اور نفرت دراصل ایک ہی سکتے کے دو رخ ہیں۔ جذبات کے بازار میں دونوں کا مول یک ساں رہتا ہے، مگر جب کسی انسان کو دوسرے سے نفرت ہو جاتی ہے، تو وہ اس سے وابستہ چیزوں، جگہوں، یادوں اور ایک دوسرے سے جُڑے معمولات سے بھی کیوں نفرت کرنے لگتا ہے۔ جس راستے پر کبھی دو پیار والے ایک ساتھ چلے تھے، وہ راستہ کیوں علاقہ ممنوع ہو جاتا ہے۔ وہ ایک بیٹج، جہاں کبھی وہ ساتھ بیٹھے تھے، بارش میں گیلی سڑک کے کنارے کھڑا وہ چائے والا، جس کے ایک کپ میں دونوں نے ساتھ چائے پی تھی۔ وہ کتابوں کی پرانی دکان، پہلی ٹوٹی ہوئی چوڑی کا کٹڑا، صفحوں میں رکھا وہ سوکھا گلاب، پرفیوم کی خالی شیشی، بچی ہوئی وہ آدھی لپ اسٹک، ایک کھویا ہوا کف لنک، ایک ساتھ دیکھی ہوئی فلم کا ٹکٹ، وہ فٹ پاتھ پر بچھے پتے، وہ پرانا بس اسٹاپ، 23 نمبر کی کھنار اسی بس، درخت کے نیچے کھڑا وہ لیموں پانی والا..... بھلا ان سب چیزوں کا ان کی بدلتی محبت اور نفرت میں ڈھلتی اس کڑا وہٹ سے کیا تعلق.....؟؟ ہم اس ایک شخص کی نفرت میں ان سب یادوں، باتوں اور جگہوں کو کیوں شامل کر لیتے ہیں۔ انسان کتنا غالم ہے کہ معصوم یادوں سے بھی انتقام لینے سے باز نہیں آتا۔

ڈرامے والے دن ہال کچا کچھ بھرا تھا۔ ساری یونیورسٹی اوتھیلو کو اردو میں جملے بولتے دیکھنے کے لیے جمع تھی اور..... ہیروئن کی آخری سانس نکلنے سے پہلے پس منظر میں میری نظم کے بول گونج اٹھتے ہیں۔ سنو، تمہاری وفا پر..... گرچہ پورا یقین ہے، مگر..... بدلتی رُتوں کے وارکا، کچھ بھروسا نہیں..... سو، گر کبھی ایسا ہو کہ..... تمہیں مجھ سے نفرت ہو جائے..... اور میری روح کی کوئل پتھڑیاں..... تمہیں کسی بول کے مانند چُھنے لگیں، تو..... بیٹے دنوں کو یاد نہ کرنا..... کہ یادوں کا زہر، زخم کو بھرنے نہیں دیتا..... ہاں مگر دیکھو، کبھی ان باتوں سے نفرت نہ کرنا..... جو ہم نے گھنٹوں ایک ساتھ بیٹھ کر کی تھیں..... کہ باتیں تو معصوم رابطہ ہوتی ہیں..... اور کسی کم نصیب کی بے ربطی سے..... ان باتوں کا کیا لینا دینا.....؟ ڈرامے کے منظر میں اوتھیلو ہیروئن کے پاس پہنچتا ہے۔ رات ڈھل رہی ہے اور ہیروئن (ڈیسنڈی مونا) سو رہی ہے۔ اوتھیلو اپنی محبوبہ کو جگاتا ہے اور سرد لہجے میں اس سے کہتا ہے کہ وہ اپنی آخری دعا کر لے۔ اوتھیلو کی محبوبہ کی آنکھوں میں آنسو بھرتے ہیں، وہ اپنے محبوب سے التجا کرتی ہے کہ وہ اسے آج کی رات جینے دے، پھر چاہے تو صبح مار ڈالے، مگر اوتھیلو کی آنکھوں پر شک کے کالے ناگ کس کر پٹی باندھ چکے ہیں، وہ کہتا ہے ”اب بہت دیر ہو چکی.....“

پس منظر میں نظم کے بول اور لپ ہو رہے تھے۔ اور سنو، میرے محبوب..... کبھی ان رنگوں سے نفرت نہ کرنا..... جو مجھے بہت اچھے لگتے تھے..... کہ تنگ تو روح کو اُجاالتے ہیں..... اور کسی کے مقدر کے اندھیروں سے..... ان رنگوں کا کیا لینا دینا.....؟ ڈیسنڈی مونا آخری مرتبہ اپنے محبوب، اوتھیلو کو بیگلی پلکوں سے نظر بھر کر دیکھتی ہے۔ اوتھیلو کے بھاری ہاتھوں کی انگلیاں اس کی نازک شررگ کو دبانا شروع کر دیتی ہیں۔ لڑکی سانس گھٹنے کی وجہ سے تڑپتی ہے اور بستر کی چادر نیچے گر جاتی ہے۔ اے میری وفا کے مالک..... کبھی ان نظاروں سے نفرت نہ کرنا..... جو ہم نے ایک ساتھ دیکھے تھے..... کہ نظارے تو قدرت کا خُسن ہوتے ہیں..... اور کسی حرام نصیب کی بد صورت یادوں سے..... ان نظاروں کا کیا لینا دینا.....؟ اوتھیلو کی مضبوط گرفت میں اس کی محبوبہ کا دم گھٹ رہا ہے اور وہ بن پانی کی مچھلی کی طرح تڑپ تڑپ کر جان دے رہی ہے۔ اوتھیلو کی آنکھیں وحشت سے باہر کو ابل رہی ہیں، مگر وہ پوری قوت سے اپنی جان سے پیاری ڈیسنڈی مونا کا گلا گھونٹ رہا ہے۔ تکلیف کی شدت سے اس کی محبوبہ کی انگلیوں کے ناخن اوتھیلو کے بازوؤں کی رگوں میں پیوست ہوئے جا رہے ہیں۔ لڑکی کا نازک بدن آخری مرتبہ زور سے کانپتا ہے۔ میرے ہم نفس..... میری جان..... بس مجھ سے، اور صرف مجھ سے نفرت کرنا..... کہ میری روح کی سیاہی سے ہی..... یہ چار سواں اندھیرا ہے۔ اوتھیلو کی محبوبہ اپنے محبوب کی گرفت میں تڑپ کر آخری ہنگی لیتی ہے اور اس کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر جاتی ہے، مگر مرتے مرتے بھی اس کی بے جان گھٹی آنکھیں اپنے پیارے اوتھیلو کی کوئی دیکھ رہی ہیں، لڑکی کا محبوب، اس کا قاتل، اوتھیلو اپنی محبوبہ کا سر گود میں لیے بیٹھا رو رہا ہے اور اسٹیج کا پردہ گر جاتا ہے۔

ڈراما ختم ہونے کے بعد چند لمحوں تو سارے ہال میں سنا سنا چھایا رہا اور پھر تالیوں کی گونج میں وہ شور مچا کہ بس۔ لٹنی راتوں رات سارے شہر کی یونیورسٹیز میں مقبول ہو چکی تھی۔ ڈرامے کی کامیابی کی خوشی میں اس نے اپنے گھر ایک پارٹی رکھی اور ہم سب کو تاکید کے ساتھ دعوت دی۔ میں نہیں جانا چاہتا تھا، مگر اس نے میری ایک نہیں سنی اور مجبوراً مجھے اُس شام وہاں جانا ہی پڑا۔ گھر کیا تھا، اک محل تھا۔ مغربی طرز کا ایک وسیع و عریض پھولوں بھرا باغیچہ، جس کے درمیان پریوں کے گھر جیسی ایک شان دار عمارت کھڑی تھی۔ پچھلی جانب سوئمنگ پول تھا اور پارٹی کا بندوبست وہیں کیا گیا تھا۔ موسیقی کا اہتمام بھی تھا۔ لٹنی کہیں سے اپنی ماں کو کھینچتی ہوئی لے آئی اور ان سے میرا تعارف کروایا۔ قیمتی ساڑی میں ملبوس، ہیرے جواہرات سے لدی پھندسی اس عورت نے مجھے غور سے دیکھا اور ہونٹ سیکنے کر کہا۔ ”خوب..... تو یہ ہے پُری زاد.....؟ انٹرسٹنگ۔“ میرا جی چاہا لٹنی کے کان میں دھیرے سے کہوں کہ ایسے جانے کتنے مناظر میں اردو فلموں میں دیکھ چکا ہوں، جہاں امیروں کی محفل میں غریب کو اس کی حیثیت یاد دلانی جاتی ہے، پھر مجھے خود اپنی سوچ پر ہنسی آگئی۔ اتنے میں میرے عقب سے ایک بھگی ہوئی آواز بلند ہوئی۔ ”اٹھا..... تو یہ ہیں مسٹر پُری زاد..... جن کی شاعری ڈرامے میں ڈب کی گئی تھی، بھئی واہ لٹنی، کیا اداکاری کی تھی تم نے.....“ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ ایک پکلی عمر کا موٹا سا شخص آہستہ آہستہ ڈمگاتے قدموں سے ہماری جانب چلا آ رہا تھا۔ لٹنی نے تعارف کروایا کہ ”یہ سیٹھ عابد ہیں، ان کے خاندانی دوست۔“ وہ شخص لٹنی سے بہت بے تکلف ہونے کی کوشش کر رہا تھا یا پھر یہ نشے کا کمال تھا۔ میں ایک جانب ہٹ کر کھڑا ہو گیا تاکہ لٹنی کو فرصت ملے تو میں اس سے اجازت لے کر وہاں سے نکل جاؤں۔ سیٹھ عابد کھانا لے کر پلٹا تو اس کی نظر پھر مجھ پر پڑ گئی اور وہ میری طرف چلا آیا۔ ”اور جناب! کیا مصروفیات ہیں آج کل، دراصل میں خود بھی چھوٹا موٹا شاعر ہوں، اور چاہتا ہوں کہ جلد ہی میری کتاب بھی میرے مداحوں کی پیاس بجھانے کے لیے شائع ہو جائے، مگر کیا کروں۔ یہ کاروبار اور دھند ہی جان نہیں چھوڑتا۔“ سیٹھ عابد نے وہیں کھڑے کھڑے اپنی دو چار غزلیں بھی مجھے سنائیں، جنہیں سن کر میں نے شکر کیا کہ اس کی کتاب ابھی تک شائع نہیں ہوئی۔ سیٹھ عابد اپنی دھن میں گن بولے جا رہا تھا۔ ”لٹنی! تمہاری شاعری کی بڑی تعریف کرتی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم میری شاعری کی نوک پلک سنو اگر اسے بھی ایسا بنادو کہ وہ لٹنی کے معیار پر پوری اتر جائے۔“ میں نے حیرت سے سیٹھ عابد کی طرف دیکھا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ چاہتا تھا کہ میں اپنی شاعری اس کے نام کر دوں۔ سیٹھ عابد نے میری آنکھوں میں جھانکا۔ ”اور اس کام کے لیے میں ایک خطیر رقم دینے کو بھی تیار ہوں۔ لٹنی بتا رہی تھی کہ تم ٹیوشنرز پڑھا کر اپنی پڑھائی کا خرچہ پورا کرتے ہو۔“ میں اپنے غصے پر قابو نہیں رکھ سکا۔ ”معاف کیجیے گا عابد صاحب، زندگی میں ہر چیز بکاؤ نہیں ہوتی۔“ عابد طنزیہ انداز میں مسکرایا۔ ”غلط..... آج کل سب بکاؤ ہے اور جس محفل میں آج تم کھڑے ہو، ان اُمراء کے لیے تو یہ شاعری، یہ خوب صورت الفاظ محض ایک شام بہلانے کے کام آتے ہیں۔ ذرا ٹھنڈے دل سے سوچ لینا۔ میں نے بڑے بڑے قلم کاروں کے مسودے رڈی کے بھاؤ پکتے دیکھے ہیں۔“ میں لٹنی سے اجازت لے کر واپس چلا آیا۔ جب انسان کے پاس دولت کی بہتات ہو تو اس کے اندر کا کباڑیا کیوں جاگ جاتا ہے؟ کیا یہ سبھی امیر ایک جیسے ہوتے ہیں؟ مگر لٹنی تو ان جیسی نہیں۔ میں نے ہمیشہ اس کی آنکھوں میں اپنے لفظوں کے لیے ایک خاص احترام دیکھا تھا۔ میرا بھولا دل ایک بار پھر راہ بہنکٹنے کے بہانے ڈھونڈ رہا تھا۔

اگلے دن لٹنی نے مجھے یونیورسٹی میں پُچپ اور اُداس دیکھا تو اُسے لگا کہ میں گزشتہ شام کے اُس کی ماں کے سلوک سے دل برداشتہ ہوں۔ اس نے مجھ سے معذرت کی، مگر میں نے اسے تسلی دے دی کہ میں اس سلوک کا عادی ہوں، میری بات سُن کر اُس کی سیاہ جھیل سی آنکھوں میں اُداسی اتر آئی۔ مجبوراً اس کا دل بہلانے کے لیے مجھے اردو فلموں والی مثال دہرائی پڑی کہ اس کی پارٹی میں آنے سے پہلے میں نے درجن بھر ایسی فلمیں دیکھ کر خود کو پہلے ہی ذہنی طور پر تیار کر لیا تھا، البتہ بس ایک کمی رہ گئی کہ وہاں کوئی بڑا سا بیٹا تو نہیں تھا، جس پر بیٹھ کر ایسی پھویشن میں غریب لڑکا ہیروئن کے لیے گانا گاتا ہے۔ میری بات سن کر وہ زور سے ہنس پڑی۔ اور یوں لگا جیسے تیز بارش میں دھوپ نکل آئی ہو۔

اور پھر چند دن بعد لٹنی نے اچانک یونیورسٹی آنا بند کر دیا۔ میں نے اس کے سب دوستوں سے پوچھا، مگر کسی کو کچھ پتا نہیں تھا۔ آخر پانچویں دن میں دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس کے بچکے کے دروازے پر پہنچ گیا۔ چونکدار نے لٹنی کے نام پر مجھے گھر کے لان تک پہنچا دیا۔ لان میں لگے سب مرمَر کے بڑے فوارے کے پاس لٹنی کی ماں کو بیٹھے دیکھ کر میرے قدم اٹکنے لگے۔ دوسرا جھٹکا مجھے لٹنی کی ماں کی انگلیوں میں پکڑے سگریٹ کو دیکھ کر لگا۔ اس نے غور سے میری طرف دیکھا اور سگریٹ کی راکھ جھاڑ کر بولی۔ ”لٹنی سے ملنے آئے ہو؟“ میں نے شپٹا کر جواب دیا۔ ”جی“ لٹنی کی ماں نے میری آنکھوں میں جھانکا۔ ”محبت کرتے ہو، میری بیٹی سے.....؟“ مجھے لگا، جیسے کسی نے میرے قدموں کے نیچے سے زمین کھینچ لی ہو۔ لٹنی کی ماں کی آنکھیں مجھے اپنے جسم کے پار ہوتی محسوس ہو رہی تھیں۔

(جاری ہے)



.....ہاشم ندیم.....

ہاشم ندیم نوجوان نسل کے پسندیدہ، ملکہ کے معروف و منفرد ڈراما رائٹر، ناول نگار ہیں۔ ان کے ناول ”خدا اور محبت“ اور ”بچپن کا دبیر“ نے بین الاقوامی پذیرائی حاصل کی، تو جنگ، سنڈے میگزین میں شائع ہونے والے ناول ”عبداللہ“ کو بھی وقت کے پسندیدہ ترین ناول کا درجہ حاصل ہوا۔ انہیں ان کی ادبی خدمات پر حکومت پاکستان نے تمغہ حسن کارکردگی سے نوازا۔ نیز، فلم کے شعبے میں ”عبداللہ“ نامی ایک بین الاقوامی فلم کے تخلیق کار کی حیثیت سے بھی قدم رکھ چکے ہیں۔

”پری زاد“ ایک اچھوتے، حساس اور قدرے مشکل موضوع پر مبنی بہت دل گداز سی تحریر ہے، یہ ایک ایسے شخص کی کہتا ہے، جسے اک کم صورتی کے عیب کے سبب، اس ظاہر پسند، زر پرست دنیا کے اُن گنت بد صورت رویوں، بد ہیئت آئینوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ناول سے متعلق اپنی آراء سے آگاہ کرنا ہرگز مت بھولے گا۔ ہمارا پتا وہی پرانا ہے:

ایڈیٹر، ”سنڈے میگزین“ روزنامہ جنگ، شعبہ میگزین، اخبار منزل، آئی آئی چندریگر روڈ، کراچی۔ ای میل:

sundaymagazine@janggroup.com.pk

لہٰذا کی ماں کی بات سُن کر چند لمحوں کو تو میں گنگ سارہ گیا۔ وہ مجھے غور سے دیکھتے ہوئے بولیں۔ ”جواب دو، کیا میں غلط کہہ رہی ہوں، تمہارے چہرے پر صاف لکھا ہے کہ تم لہٰذا کی ماں سے محبت کرتے ہو۔“ میں کوئی جواب نہ دے سکا۔ پھر شاید ان کو خود ہی میری حالت پر ترس آ گیا۔ ”اندر چلے جاؤ، وہ ڈرائنگ روم میں ہوگی۔“ میں تیز تیز قدم اٹھاتا اندر کی جانب بڑھ گیا۔ لہٰذا کی ماں کی کھڑکی کے قریب اُداس سی کھڑی تھی۔ مجھے دیکھ کر ایک پھکی سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر پھیل گئی۔ ”پری زاد کیسے ہو؟“ میں نے پُچھوئے ہی سوال کیا؟ ”آپ اتنے دن سے یونیورسٹی کیوں نہیں آئیں۔ سب ٹھیک تو ہے نا۔“ لہٰذا کی ماں نے میری طرف دیکھنے سے گریز کیا۔ ”ہاں..... میں نے یونیورسٹی چھوڑ دی ہے۔ منانے میری شادی طے کر دی ہے۔“ میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ ”شادی یوں اچانک، مگر کس کے ساتھ؟“ ”سیٹھ عابد کے ساتھ۔ میری شادی عابد سے ہو رہی ہے۔“ یہ میرے لیے دوسرا جھٹکا تھا۔ ”سیٹھ عابد سے مگر، آپ اور وہ، میرا مطلب ہے، آپ کے لیے اس شخص سے کہیں بہتر لوگ موجود تھے۔“ لہٰذا کی پلکیں نم ہونے لگیں۔ ”بات میرے انتخاب کی نہیں ہے پری زاد۔ اونچی بولی کی ہے، جو بھی میرے لیے اونچی بولی لگائے گا، میرا ہاتھ اس کے ہاتھ میں تھما دیا جائے گا۔ عابد کی بولی پندرہ کروڑ تھی۔ میری نیلامی میں اس سے اونچی بولی کسی اور نے نہیں دی۔ لہٰذا مجھے عابد کے نام کر دیا گیا۔“ مجھ سے برداشت نہیں ہوا اور میں بول پڑا۔ ”بولی شریف لڑکیوں کی نہیں لگتی ہے لہٰذا جی، شریف گھرانوں کی لڑکیاں تو رخصت ہوتی ہیں، عزت کے ساتھ۔“ لہٰذا کی آنکھ سے ایک آنسو پڑا۔ ”تو پھر یہی سمجھ لو کہ میں بھی وہیں سے تعلق رکھتی ہوں، جہاں لڑکیوں کی بولیاں لگتی ہیں۔ رخصتی نہیں ہوتی۔“ مجھے سب کچھ گھومتا ہوا محسوس ہوا۔ ”یہ..... یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟“ ”ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ اب میں یونیورسٹی نہیں آؤں گی پری زاد۔ پندرہ دن کے بعد میری دنیا دکھاوے کے لیے وہ رسم بھی ادا ہو جائے گی، جسے یہاں رخصتی کہتے ہیں۔“ لہٰذا کی آنکھیں اب باقاعدہ برسنے لگی تھیں۔ تم سوچ رہے ہو گے کہ یہ عالی شان گھر، یہ رہن سہن اور میری یہ اعلیٰ تعلیم..... یہ سب دکھاوا ہے پری زاد۔ ہماری یہ شان و شوکت ان ہی سیٹھ عابد جیسے لوگوں کے دم سے ہے۔ جسے لوگ کبھی بازارِ حسن کہا کرتے تھے، اب وہ بازار کسی خاص علاقے تک محدود نہیں رہا۔ پچھلے کرشروں کی ان اونچی اور اعلیٰ بستیوں تک پہنچ گیا ہے، اور جسے میں اپنی ماں کہتی ہوں، پتا نہیں، وہ میری سگی ماں ہے بھی یا نہیں۔ یہ بھی اس کا احسان ہے کہ اس نے مجھے اپنی تعلیم کا شوق پورا کرنے دیا یا شاید یہ بھی بازار میں بولی بڑھانے کا ایک کارآمد ٹھکانہ ہوگا۔“ لہٰذا کی بولنے بولتے خاموش ہو گئی۔ میرے پاس بھی اب کہنے کے لیے کچھ نہیں بچا تھا، سو، واپسی کے لیے قدم اٹھا دیے کہ عقب سے لہٰذا کی آواز آئی۔ ”میں نے یہ سب کچھ تمہیں اس لیے بتایا ہے پری زاد کہ تم ایک سچے دوست ہو۔“ میں نے پلٹ کر سرٹھکائے سیاہ لباس میں ملبوس، ڈھلتی سُرمئی شام جیسی لہٰذا کی وجود کو آخری بار اپنی دھکتی آنکھوں کے آئینے میں سمویا۔ اس کے گلابی عارض آنسوؤں سے دھل سے گئے تھے۔ ”لہٰذا جی..... کاش! میرے پاس پندرہ کروڑ روپے ہوتے تو میں آپ کو خرید کر آزاد کر دیتا۔ مگر آپ تو جانتی ہیں کہ زندگی کی اصل فلم میں لڑکے کے پاس لڑکی کے ماں باپ کو ادا کرنے کے لیے کبھی پیسے نہیں ہوتے۔ وہ تو بس کسی اور کے خریدے گئے پیاؤ پر بیٹھ کر جڈائی کا گانا ہی گاسکتا ہے۔“ لہٰذا کی ہونٹوں پر میری بات سُن کر ذرا دیر کے لیے ایک ہلکی سی مسکان اُبھری اور میں اس کا، وہی آخری مدھر مسکان بھرا چہرہ، آنکھوں میں لیے پلٹ آیا۔ لان میں فوارے کے قریب کرسی ڈالنے لہٰذا کی ماں ابھی تک بیٹھی فون پر کسی سے بات کر رہی تھیں۔ مجھے واپس جانا دیکھ کر فون کاٹ دیا اور پھر ان کی کاروباری آواز نے جیسے میرے قدم جکڑ لیے۔ ”سُلو کے! میری ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا، زندگی میں کچھ حاصل کرنا چاہو، تو اپنی جیب میں اس کے دام ضرور رکھو۔ شاید اس وقت میں تمہاری نظر میں ایک بہت بڑی عورت ہوں، مگر تمہیں ایک بچے کی بات بتا رہی ہوں۔ مرد کی شکل اور شخصیت کوئی نہیں دیکھتا۔ سب اس کا رُتبہ اور عہدہ پرکتے ہیں۔ دولت مرد کے ہر عیب، ہر خامی پر پردہ ڈال دیتی ہے۔ آئندہ زندگی میں کچھ پانا چاہو تو میری نصیحت ہمیشہ یاد رکھنا۔“

پندرہ دن بعد شہر کے تمام بڑے اخباروں میں ملک کے معروف صنعت کار، سیٹھ عابد کی دوسری شادی کی خبریں نمایاں طور پر شائع ہوئیں۔ میں نے بے زاری سے اخبارات یونیورسٹی کی لائبریری کی میز پر بیٹھ دیے۔ ٹھیک ہی کہا تھا لہٰذا کی ماں نے، سارا کھیل پیسے کا ہے، جیب میں دھیلا نہ ہو تو یہ سوچ، الفاظ، اعلیٰ خیالات اور ادب و فن، سب کسی کام کے نہیں۔ دمڑی پاس ہو تو پھر سارا میلہ ہی اپنا ہے۔ میں ان ہی خیالات میں گھرا گھر آیا تو دونوں بڑے بھائی اور بھابھیاں استقبال کے لیے تیار کھڑے تھے ”ہاں میاں..... اور کتنی چلے گی تمہاری یہ پڑھائی، گھر کے خرچوں کا کچھ اندازہ بھی ہے تمہیں۔ اب تمہاری ان شام کی دو ٹیوشنوں میں گزارہ نہیں ہوتا۔“ دوسرے بھائی بولے۔ ”میں تو کہتا ہوں کہ پڑھ لکھ کر بھی تمہیں کون سا کہیں کلکٹر لگ جاتا ہے۔ وہی کلر کی ہوگی اور وہی مہینے بھر کے پانچ سات ہزار۔“ بھابھی نے مشورہ دیا ”میری مانو تو کوئی کل وقتی ملازمت پکڑ لو۔ بھئی، سچ تو یہ ہے کہ اب ہمارے اپنے بچوں کے خرچے اتنے بڑھ چکے ہیں کہ ہمیں خود اپنے منہ سے کہتے شرم آتی ہے۔ تمہاری عمر کے محلّے کے سب لڑکے نوکریوں پر لگ کر اپنا گھر چلا رہے

ہیں۔“ میرے لیے ان کے یہ جملے کچھ نئے نہیں تھے، ہنسنے میں ایک آدھ بار یہ قسط وار سیریل ضرور چلتا تھا، مگر آج نہ جانے کیوں میرا دل پہلے ہی اتنا بھرا ہوا تھا کہ میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی تلخ لہجے میں ان سب سے کہہ دیا کہ اگر اس گھر کا کاروبار میری کمائی کی وجہ ہی سے رُکا ہوا ہے تو میں کوشش کروں گا کہ اسی ماہ کوئی نوکری یا مزدوری پکڑ کر ان سب کے منہ بند کر دوں۔ گھر والے ٹھیک ہی کہتے تھے، ڈگری مل جانے کے بعد بھی مجھ جیسے جانے کتنے، نوکری کے لیے برسوں جوتیاں چٹاتے پھرتے ہیں۔ اور پھر انٹرویو، جو کسی بھی نوکری کا لازمی جزو ہوتا ہے، اس کے لیے اچھی شخصیت کا ہونا کبھی کبھی شرط اول بن جاتا ہے اور میری شخصیت..... مجھے تو شاید کوئی بڑی فرم یا دفتر انٹرویو کے لیے طلب ہی نہ کرے۔ مگر نوکری یا کام ملنے کے لیے میرے پاس کوئی ہنر بھی تو نہیں تھا۔ مجھے یاد آیا کہ محلے کا ایک لڑکا، شوکی بچپن ہی سے کسی ویلڈنگ گیراج پر مزدوری پر لگ گیا تھا اور اس کی ماں کے بقول ہر ماہ ایک معقول رقم گھر والوں کے ہاتھ پر لا کر رکھتا تھا۔ میں نے سوچ لیا کہ فائل امتحانات، جو اگلے ماہ شروع ہو رہے تھے، ان کی تیاری میں مزید وقت ضائع نہیں کروں گا اور آج گھر جانے سے پہلے کوئی نہ کوئی کام ضرور ڈھونڈ کر پلائوں گا۔ شوکی کے گیراج کا پتا مجھے معلوم تھا۔ میں نے گیراج کے گیٹ پر پہنچ کر سامنے کام کرتے لڑکے سے شوکی کے بارے میں پوچھا، تو لڑکا شوکی کو بلانے اندر چلا گیا۔ میں نے آس پاس نظر دوڑائی۔ گیراج کے گیٹ کے اوپر ایک بورڈ پر بڑا بڑا ”استاد مستانہ ویلڈنگ گیراج“ لکھا تھا۔ کچھ ہی دیر میں شوکی نمودار ہوا اور مجھے گیٹ پر کھڑے دیکھ کر گرم جوشی سے آگے بڑھ کر ملا۔ ”ارے..... پُری زاد بھائی آپ، یہاں..... سب خیر تو ہے؟“ میں نے ایک لمبی سانس بھری۔ ”ہاں، سب خیر ہے۔ مجھے تمہارے گیراج میں کوئی کام مل سکتا ہے کیا، مجھے کام کی تلاش ہے۔“ شوکی کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ ”آپ، یہاں کام کریں گے، مگر آپ تو پڑھ لکھے ہو پُری بھائی۔“ میں نے شوکی کو ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں سمجھانے کی کوشش کی کہ نوکری اب میری ضرورت سے بڑھ کر مجبوری بن چکی ہے۔ اتنے میں گرتے شلوار میں ملبوس اُوپر سیاہ واسکٹ پہنے، کانوں میں موٹیے کا بھول سجائے ایک شخص باہر سے اندر داخل ہوا، جس کے تیل میں چڑے بال ایک جانب سلیقے سے کڑھے ہوئے تھے۔ ہونٹوں پر پان کی لالی اور پتلی طرح دار مونچھیں، دونوں جانب سے اوپر اٹھی تھیں۔ اس نے شوکی کے سلام کے جواب میں مجھے غور سے دیکھا اور دھیرے سے گنگناتے ہوئے بولا ”وہ آئے ہمارے گھر میں، خدا کی قدرت ہے..... میاں شوکی! یہ حضرت کون ہیں؟“ شوکی نے جلدی سے میرا تعارف کروایا۔ ”یہ پُری زاد بھائی ہیں استاد جی، میرے محلے میں رہتے ہیں اور کسی کام کی تلاش میں ہیں۔“ استاد مستانہ پر بھی میرے نام کا وہی اثر ہوا، جس کا میں ہمیشہ سے عادی تھا۔ میں نے درپیش آنے والی بحث کو مختصر کرنے کی غرض سے بولنے میں پہل کی۔ ”اگر میری صورت اور تعلیم آپ کی راہ میں حائل نہ ہو تو کیا آپ مجھے کوئی کام دے سکتے ہیں۔ میں بہت محنت کروں گا اور جلد ہی سیکھ جاؤں گا۔“ استاد مستانہ میری بات سن کر ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔ ”معاف کرنا میاں..... شاید تم بُرا مان گئے۔ میرا مقصد تمہارا دل دکھانا ہرگز نہیں تھا، تم کرتے کیا ہو.....؟“ میرے بولنے سے پہلے شوکی بول اُٹھا ”پُری زاد بھائی یونیورسٹی میں پڑھتے ہیں استاد۔“ استاد نے غور سے میری طرف دیکھا۔ ”گلتا ہے کوئی بہت بڑی مجبوری ہے؟“ ”ہاں، ایسا ہی سمجھ لیجیے۔“ مستانہ استاد نے فیصلہ کرنے میں دیر نہیں لگائی، ”ٹھیک ہے میاں..... کب سے کام پر آنا چاہتے ہو؟ فی الحال تمہیں دیہاڑی پر رکھ سکتا ہوں۔“ میں نے آستینیں چڑھا لیں۔ ”آج سے استاد۔“ رات دیر گئے، میں گھر واپس پہنچا تو حسب معمول میرا انتظار کیے بنا سب سو چکے تھا۔ میں نے اپنی زندگی کی پہلی مزدوری کی دیہاڑی کے روپے برآمدے میں پڑی چوکی پر رکھ دیئے اور صبح سویرے منہ اندھیرے پھر سے اُٹھ کر گیراج چلا گیا۔ استاد مستانہ اپنے مزاج کا ایک الگ ہی بندہ تھا۔ فلموں میں کام کرنے کا شوق، اسے لڑکپن ہی میں اس کے گاؤں سے شہر تو کھینچ لایا تھا، لیکن قسمت نے اداکار کے بجائے مسٹری بنا ڈالا۔ مگر اس کے اندر کافن کا رابھی تک زندہ تھا اور مستانہ ابھی تک ہرنی فلم کا پہلا شو، پہلے دن دیکھنے کا قائل تھا اور پھر فلم شو سے واپسی پر گھنٹوں اس کے تہرے جاری رہتے۔ ”کیا خاک ایکٹنگ کی ہیرو نے، ہاں ولن نے پھر بھی کچھ رنگ جمایا..... نہ میاں! موسیقی کا تو بیڑہ غرق ہی کر دیا ہے، ان نئے لڑکوں نے، اور شاعری بھی کیا بے ہودہ اور بکواس ہو گئی ہے، ٹو فلانے کا باپ، میں فلانے کا بیٹا، بھلا یہ بھی کوئی شاعری ہے؟ شاعری تو تب ہوا کرتی تھی۔ جائیے آپ کہاں جائیں گے، یہ نظر لوٹ کے پھر آئے گی..... تیرے میرے سنے اب ایک رنگ ہیں..... عجیب داستاں ہے یہ، کہاں شروع، کہاں ختم..... واہ واہ کیا بات تھی اس شاعری کی۔“ استاد مستانہ گھنٹوں بولتا رہتا اور ہم سارے شاگرد پُچپ چاپ اس کے تہرے سنتے رہتے۔ مجھے استاد نے ویلڈنگ پلانٹ پر بیٹھنے سے پہلے ایک طویل لیکچر دیا۔ ”دیکھ میاں! یہ جو آگ کی چنگاریاں ہیں، یہ آج سے تمہارے لیے پھول کلیاں اور پھلجھڑیاں ہیں۔ یہ ایک آدھ دن ہی میں تمہارے لباس میں ہزاروں ننھے منے شگاف ڈال دیں گی۔ تمہارے ہاتھوں اور جسم کے گھلے حصوں پر انگاروں کی طرح برس کر تمہارے سارے جسم کو داغ دار کر دیں گی۔ شروع شروع میں کافی جلن بھی ہوگی، مگر پھر دھیرے دھیرے یہ آگ تمہاری دوست بن جائے گی اور تمہیں ان چنگاریوں کی عادت پڑ جائے گی۔ آگ کے ان جگنوؤں سے جتنی جلدی آشنائی ہو جائے، اتنا ہی بہتر ہے۔ ان سے بچنے کی کوشش کرو گے تو کام نہیں سیکھ سکو گے۔“ اب میں استاد کو کیا بتاتا کہ جو پہلے سے جل کر راکھ ہو چکے ہوں، ان کا بھلا یہ بھڑکتی آگ کیا باڈوے گی؟ اور پھر جلن کے لیے احساس زندہ ہونے کی ضرورت ہوتی ہے، مجھ جیسے بے حسوں کے لیے کیا چنگاری اور کیا پھلجھڑی۔

یونیورسٹی کا فائل امتحان بھی میں نے جیسے تیسے کر کے دے ہی ڈالا۔ حالاں کہ اب مجھے ڈگری لینے میں کوئی خاص دل چسپی نہیں تھی۔ ان ہی دنوں میرے ہم جماعتوں نے مجھے بتایا کہ یونیورسٹی کے سالانہ رسالے میں میری بہت سی شاعری کو اکٹھا کر کے ایک خاص نمبر بھی نکالا گیا ہے۔ میں نے کسی کے ہاتھ وہ رسالہ منگو لیا اور ایک دن گیراج میں بیٹھا اسی رسالے کی ورق گردانی کر رہا تھا کہ استاد نے مجھے دیکھ لیا اور میرے ہاتھ سے رسالہ جھپٹ کر اس پر ایک طائرانہ سی نظر ڈالتے ہی اُس کی آنکھیں گھل گئیں۔ ”ارے واہ میاں! تو تم شاعر بھی ہو۔ بھئی کمال ہے، بتایا کیوں نہیں پہلے؟“ میں نظریں چرا گیا۔ ”اس میں بتانے لائق کیا تھا بھلا؟“ ”کیا مطلب، تم شاعری کو معمولی بات سمجھتے ہو۔ مجھ جیسوں سے اس کی قدر پوچھو میاں! کیا رچاؤ ہے تمہارے لفظوں میں، ہر ایک مصرع، دوسرے سے بڑھ کر، استاد نے وہیں باہر سردیوں کی ڈھلتی دھوپ میں کرسی ڈالوائی اور سورج ڈوبنے سے قبل وہ سب کچھ حفظ کر ڈالا۔

میں بہت دیر سے لوہے کے ایک بڑے پڑی نما کٹڑے کو کانٹنے کی تک دو دو میں الجھا تھا، مگر اس دن ایسا لگ رہا تھا، جیسے شعلے کو بھی مجھ سے کوئی پیر ہو گیا ہے۔ جب انسان کا وقت بُرا ہو تو ہر چیز اپنا تاثر کھودتی ہے۔ شبنم آگ اگلنے لگتی ہے اور شعلے سرد پڑ جاتے ہیں۔ استاد مجھے بہت دیر تک اس سرد چنگاری میں فولاد کانٹنے کی لا حاصل سعی کرتے دیکھتا رہا اور پھر اٹھ کر میرے قریب آ گیا۔ ”کبھی کبھی تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس بھڑکتی ہوئی آگ سے کہیں زیادہ تپش تمہارے اپنے اندر ہے، جو ہر پل تمہیں جھلساتی رہتی ہے۔ پڑی زاد میاں، کیوں اپنی جوانی ان شعلوں میں راکھ کر رہے ہو، آخر ایسی کیا مجبوری ہے تمہاری۔“ میں نے مستانہ استاد کی آنکھوں میں جھانکا۔ ”پیسہ..... مجھے لگتا ہے میری ہر کم زوری، ہر عیب اور ہر خامی کا علاج صرف پیسا ہے استاد اور مجھے زندگی میں بہت سارا پیسا کمانا ہے۔“ استاد نے بے چارگی سے میری طرف دیکھا۔ ”پر، اس روزانہ کی مزدوری سے تم کتنا کما سکو گے۔ دن رات محنت کرو، تب بھی سینے کے آخر میں تمہارے ہاتھ میں پندرہ بیس ہزار سے زیادہ کچھ نہیں آئے گا۔ البتہ چند سالوں کے اندر تمہاری جوانی ضرور گھل چکی ہوگی اور تمہاری نظر الگ جواب دے جائے گی۔“ میں بے بسی سے ہار کر بولا۔ ”تو پھر میں کیا کروں..... مجھے بہت پیسا کمانا ہے استاد۔ بہت زیادہ۔ اتنا زیادہ کہ اس کی چمک سے میرے وجود کا ہر داغ، ہر عیب چھپ جائے۔“ ”اگر تم پیسا کمانا چاہتے ہو تو دینی چلے جاؤ، وہاں اس ہنری بہت مانگ ہے، اگر قسمت نے ساتھ دیا تو چند سالوں میں کافی کما لو گے۔ کم از کم اپنا گیراج تو کھول ہی سکو گے۔“ میں استاد سے یہ نہیں کہہ پایا کہ میں صرف ایک گیراج نہیں، یہ پورا شہر خریدنا چاہتا ہوں۔ ”استاد! کیا تم مجھے دینی بھجوا سکتے ہو کسی طرح؟“ ”دینی جانا اتنا آسان نہیں ہے میاں۔ ویزا، ٹکٹ اور قدم جمانے کے لیے تین چار ماہ کے قیام پر چار پانچ لاکھ روپيا تو لگ ہی جائے گا۔ اور پھر آگے تمہاری قسمت کہ تمہیں لمبے عرصے کے لیے کوئی کفیل ملتا ہے کہ نہیں۔“ اگلا پورا ہفتہ میں یہی سوچتا رہا کہ آخر، ہمارے مقدر کا ہر فیصلہ کاغذ کے ان چند ٹکڑوں ہی سے کیوں مجبور ہوتا ہے، لوہے کے پرانے صندوق سے سردیوں کے کپڑے ڈھونڈتے ہوئے میں ایسی ہی کسی سوچ میں گم تھا کہ اچانک میری نظر کالج اور یونیورسٹی کے دور میں لکھی گئی اپنی شاعری کے رجسٹر پر پڑی۔ کبھی میرا خواب تھا کہ میری شاعری کا مجموعہ بھی بازار میں آئے اور میری کتاب کی پزیرائی میں شہر کے دانش ور شا میں منعقد کریں اور مجھے بھی لوگوں کے جھگٹے میں سراہا جائے۔ رجسٹر کے ورق پلٹتے ہوئے میری پلکیں بھینگنے لگیں، کبھی کبھی مجھے یوں محسوس ہوتا تھا، جیسے ہمارے سینے میں دھڑکتے دل کا رشتہ باقی جسم سے کسی سوتیلے جیسا ہوتا ہے۔ سارا جسم اور اعضاء جب ایک دوسرے کے ساتھ تال میل میں جڑے رہتے ہیں، تب یہ سوتیلا تنہا اور اداس کسی روٹھے بچے کی طرح ڈور بیٹھا کسی اور ہی دنیا میں گم ہوتا ہے۔ رجسٹر میں لکھی میری شاعری بھی کسی ایسے ہی سوتیلے اور روٹھے بچے کی باتوں جیسی تھی۔ اگلے روز میں عابد گروپ آف کمپنیز کے گیٹ پر کھڑا تھا۔ پہلے تو چوکیدار نے میرا حلیہ دیکھتے ہی مجھے صاف منع کر دیا، مگر جب میں نے اپنے نام کی پرچی انگریزی میں لکھ کر اس کے حوالے کی کہ وہ ایک بار استقبالیے پر جا کر اسے اندر بھجوادے، اگر انکار ہوا تو میں گیٹ ہی سے واپس لوٹ جاؤں گا، تو چند لمبے سوچنے کے بعد وہ اندر چلا گیا۔ مجھے اندر بلا لیا گیا اور گھنٹہ بھر انتظار کے بعد میں سیٹھ عابد کے دفتر میں اس کے سامنے کھڑا تھا۔ سیٹھ عابد نے سگار کا ایک لمبا سا کش لیا اور طنزیہ انداز میں بولا۔ ”کیوں، میں نے کہا تھا ناں، اس دنیا میں ہر چیز بکاؤ ہے، بس ٹھیک قیمت لگانے والا ہونا چاہیے، تو بولو، کتنی قیمت رکھی ہے تم نے اپنی شاعری کی۔“ میں نے اپنا رجسٹر اس کے سامنے میز پر رکھ دیا۔ ”مجھے دینی کانٹ اور ویزے کا خرچہ چاہیے۔ اگر آپ دے سکیں تو.....“ سیٹھ عابد نے رجسٹر اٹھا کر کسی دکان دار کی طرح اسے پہلے توڑا اور پھر ورق گردانی کی۔ ”ٹھیک ہے، شاعری میری کم زوری ہے، مگر پھر بھی دو سو صفحات کی یہ قیمت بہت زیادہ ہے۔“ میں نے اس کباڑیے کو غور سے دیکھا۔ ”آپ چاہیں تو بطور قرض مجھے یہ رقم دے دیں اور اسٹامپ لکھوا لیں کہ میں کسی خاص مدت کے بعد آپ کو یہ پیسے واپس لوٹا دوں گا۔ شاعری البتہ ہمیشہ کے لیے آپ ہی کی رہے گی۔“ سیٹھ عابد کے ہونٹوں پر جی طنزیہ مسکراہٹ مزید گہری ہو گئی۔ ”واپس لوٹا بھی سکو گے یا دینی جا کر غائب ہو جاؤ گے.....؟ چلو ٹھیک ہے۔ میرا سیکرٹری تم سے شاعری کے حقوق کے بارے میں کچھ دستاویزات دستخط کروالے گا۔ تمہارا دینی کانٹ اور ویزا میرے ذمے رہا۔“ میں واپسی کے لیے پلٹ کر دروازے تک پہنچا ہی تھا کہ اس کی آواز دوبارہ سنائی دی۔ ”لنچی اب بھی کبھی کبھی تمہاری شاعری کی تعریف کرتی ہے۔ مجھے امید ہے، تم نے اس رجسٹر میں لکھی شاعری اسے نہیں سنائی ہوگی۔“ میں نے دروازے کا پینڈل گھمایا۔ ”آپ بے فکر رہیں، یہ نظمیں اور غزلیں کسی کے کانوں تک نہیں پہنچیں اور آج کے بعد یہ میرے حافظے سے بھی ہمیشہ کے لیے مٹ جائیں گی۔“ اور دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔

مستانہ استاد حسب معمول اپنا چھوٹا سا ریڈیو کانوں سے لگائے کھڑا تھا اور عالم گیر کی آواز کے ساتھ سر دھن رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی بولا ”آؤ میاں آؤ! کہیں تمہارا دل بھی تو اپنے استاد سے بھر نہیں گیا۔ آج کل گیراج میں بھی دل نہیں لگ رہا تمہارا۔ نانہ پر نانہ کرنے لگے ہو۔“ میں نے استاد کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے قریب بٹھالیا۔ ”استاد! میرے دینی جانے کا بندوبست کر دو ٹکٹ اور ویزا لگو الیا ہے میں نے۔ وہاں تمہاری کوئی جان پہچان ہے تو بتاؤ۔“ استاد کے ہاتھ سے ریڈیو نیچے گر گیا، اس نے لپک کر مجھے سینے سے لگا لیا۔ ”واہ! خوش کر دیا پیارے، میں جانتا تھا کہ تم ایک دن ضرور کچھ کر دکھاؤ گے..... کب جانا ہے؟ میرا دور کا ایک برخوردار رہتا ہے وہاں۔ میں آج ہی اسے فون کر دیتا ہوں، تم اسی کے ساتھ رہو گے۔ وہ بھی وہاں اکیلا ہے، کئی سال سے..... رفیق نام ہے اس کا۔“

اگلے تین چار ہفتے یوں گزرے، جیسے چار پل گزرے ہوں۔ بھائی بھابھیاں اور گھر والے آخری وقت تک یقین اور بے یقینی کی کیفیت میں رہے اور پھر وہ دن بھی آپہنچا، جس دن میں اپنا مختصر سا سامان باندھے اتر پورٹ پر کھڑا تھا۔ میں نے اس سے پہلے کبھی جہاز سے تو کیا، ٹرین سے بھی کوئی لمبا سفر نہیں کیا تھا۔ اس لیے مجھ سے وہ تمام حماقتیں سرزد ہوتی رہیں، جو مجھ جیسے کسی بھی فرد سے پہلی بار ہوائی سفر میں ہو سکتی تھیں۔ جہاز نے دینی اتر پورٹ پر لینڈ کیا اور میں گھنٹہ بھر بعد باہر نکلا، تو بہت دیر انتظار کے باوجود مجھے رفیق کہیں نظر نہیں آیا۔ اتر پورٹ سے باہر جانے کا سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک کسی نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔ میں چونک کر پلٹا، آنے والا شخص مجھے کڑی نظروں سے گھور رہا تھا۔ ”جعلی ویزے پر دینی آئے ہو، جانتے ہو، اس کی سزا کیا ہے.....؟“

(جاری ہے)



.....ہاشم ندیم.....

ہاشم ندیم نوجوان نسل کے پسندیدہ، ملک کے معروف و منفرد رمارمارسٹر، ناول نگار ہیں۔ ان کے ناولز ”خدا اور محبت“ اور ”بچپن کا دبیر“ نے بین الاقوامی پذیرائی حاصل کی، تو جنگ، سنڈے میگزین میں شائع ہونے والے ناول ”عبداللہ“ کو بھی وقت کے پسندیدہ ترین ناول کا درجہ حاصل ہوا۔ انہیں ان کی ادبی خدمات پر حکومت پاکستان نے تمغہ حسن کارکردگی سے نوازا۔ نیز، فلم کے شعبے میں ”عبداللہ“ نامی ایک بین الاقوامی فلم کے تخلیق کار کی حیثیت سے بھی قدم رکھ چکے ہیں۔

”پری زاد“ ایک اچھوتے، حساس اور قدرے مشکل موضوع پر مبنی بہت دل گداز سی تحریر ہے، یہ ایک ایسے شخص کی کتھا ہے، جسے اک کم صورتی کے عیب کے سبب، اس ظاہر پسند، زر پرست دنیا کے ان گنت بد صورت رویوں، بد ہیئت آئینوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ناول سے متعلق اپنی آراء سے آگاہ کرنا ہرگز مت بھولے گا۔ ہمارا ہاتھ وہی پرانا ہے:

ایڈیٹر، ”سنڈے میگزین“ روزنامہ جنگ، شعبہ میگزین، اخبار منزل، آئی آئی چندریگر روڈ، کراچی۔ ای میل:

e@janggroup.com.pksundaymagazin

اس شخص کی بات سن کر چند لمحوں کے لیے تو میں گنگ ہی رہ گیا۔ دیا ر غیر میں گرفتار ہونے والے پھر مشکل ہی سے سلاخوں کے پار آ پاتے ہیں۔ سینٹھ عابد جیسے شخص سے کچھ بھی توقع کی جاسکتی تھی۔ ہو سکتا ہے، اس نے ہمیشہ کے لیے میرا بندوبست کرنے کی غرض سے مجھے جعلی ویزا ای لگوا کر دیا ہو؟ میں نے اس کی آنکھوں میں اپنے لیے ایک عجیب سی نفرت دیکھی تھی۔ یہ ویسی نفرت نہیں تھی، جو باقی سب لوگ میری بد صورتی کی وجہ سے مجھ سے محسوس کرتے تھے، یہ عداوت کچھ الگ ہی تھی۔ مجھے یاد ہے، جب میں اپنا ویزا الگا پاسپورٹ سینٹھ عابد کے دفتر سے اٹھانے کے لیے گیا، تو اس نے عجیب سی نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ ”لبنی تمہاری شاعری کی عاشق ہے۔ سچ پوچھو، تو اگر میں نے تمہیں دیکھ نہ رکھا ہوتا تو ضرور تمہیں اپنے رقیبوں میں شمار کر لیتا.....“ اب میں اسے کیا بتاتا کہ رقیب ہونا میرا نصیب ہوتا تو پھر بات ہی کیا تھی، مگر بہر حال سینٹھ عابد میرے الفاظ کا رقیب تو تھا اور اس کے لیے اتنی رقابت بھی کافی تھی شاید.....؟ میں چپ چاپ کھڑا اپنی گرفتاری کا انتظار کر رہا تھا کہ اچانک وہ شخص زور سے ہنس پڑا۔ ”اویار! تم تو سنجیدہ ہی ہو گئے۔ مجھے پہچانا نہیں۔ رفیق ہوں میں۔ استاد مستانے کا بھانجا۔“ میں نے چونک کر غور سے اسے دوبارہ دیکھا۔ استاد کے بتائے ہوئے حلیے سے تو یک سر مختلف تھا وہ۔ رفیق میری الجھن سمجھ گیا۔ ”ارے یار..... استاد نے مجھے پندرہ سال پہلے دیکھا تھا، جب میں فریکا ہوا کرتا تھا۔ ایک کم زور، لاغر اور نا کارہ سامنہ بسورتا لڑکا۔ مگر یہ دینی ہے پیارے۔ اچھے اچھوں کی کایا ملٹ دیتا ہے۔ اب مجھ ہی کو دیکھ لو۔“ رفیق نے جیب سے اپنی اور استاد کی ایک ساتھ کھنچی ہوئی پرانی بلیک اینڈ وائٹ تصویر نکالی۔ وہ واقعی بہت بدل گیا تھا۔ عربی لباس، اونچا قد، بھرا ہوا جسم اور کھلتی رنگت، کون کہہ سکتا تھا، یہ وہی پرانا فریکا ہے، جو چند سال پہلے پاکستان سے دینی کے اس صحرا میں قسمت آزمائی کے لیے اُترا ہوگا۔ میں نے شکایت کی۔ ”بہت اچھا استقبال کیا تم نے، جان ہی نکال کر رکھ دی میری۔“ وہ زور سے ہنسا۔ ”معاف کرنا یار! مذاق اپنی پرانی عادت ہے۔ ویسے تم انرپورٹ کے اس کونے میں جس طرح سبے، ڈرے ہوئے کھڑے تھے، تمہیں دیکھ کر کوئی بھی یہ سوچ سکتا تھا کہ تم غیر قانونی طریقے سے دینی آئے ہو۔“ ہم دونوں گیٹ نمبر 17 کے سامنے والے بڑے ستون کے پاس کھڑے تھے۔ دینی آنے سے پہلے فون پر رفیق کے ساتھ یہی جگہ ملنے کے لیے طے ہوئی تھی۔ انرپورٹ پر ایک نہ ختم ہونے والی بھیڑ تھی، بھانت بھانت کے لوگ، مردوزن کا ایک سیلاب، جہاں کسی کو کسی کی طرف دیکھنے یا اس پر دھیان دینے کی فرصت ہی نہیں تھی۔ ہر کوئی اپنے آپ میں گم کسی ان جانی منزل کی طرف رواں تھا، مجھے ایک عجیب سا احساس ہوا، خود کو گم کر دینے کے لیے ہمیشہ کسی جنگل یا ویرانے کی ضرورت نہیں ہوتی، انسانوں کا جھوم بھی خود کو کھودینے کے لیے بڑا کارآمد ثابت ہوتا ہے۔ رفیق میرے منع کرنے کے باوجود میرا سامان اٹھا کر انرپورٹ سے باہر نکل آیا۔ وہ مجھ سے عمر میں تین چار سال ہی بڑا ہوگا، مگر اس وقت میرے لیے ایک مکمل بزرگ کا روپ دھارے مجھے مختلف نصیحتیں کر رہا تھا۔ ”یہاں کے عرب بڑے مغرور اور اجڈ ہیں۔ انہیں خود کو دوسروں سے برتر سمجھنے کا خطہ ہے۔ اس لیے ان کے منہ لگنے سے پرہیز کرنا، ورنہ یہ اپنے بندے کا قصور ہوتے ہوئے بھی تمہی کو خطا وار سمجھیں گے اور اگلے جہاز میں بٹھا کر واپس پاکستان روانہ کر دیں گے۔ مجھے بھی ایک غم ہوگئی، ان کے نازنخرے اٹھاتے اور ان کا خطہ برداشت کرتے۔ گالی ان کی زبان پر آتے دیر نہیں لگتی اور اپنے علاوہ دوسری کبھی اقوام کو یہ اپنا خادم تصور کرتے ہیں۔ خاص طور پر ہم مزدور طبقہ لوگوں کو تو ہر پل ان کا غلام بن کر ہی گزارنا پڑتا ہے۔ لہذا دماغ ہمیشہ ٹھنڈا رکھنا.....“ رفیق نہ جانے کیا کچھ کہتا رہا اور میں حیرت سے صحرا میں سچے اس شہر کو دیکھتا رہا، جسے دیکھ کر نہ جانے کیوں مجھے پہلی ہی نظر میں یہ احساس ہوا تھا کہ

جیسے چند بدوؤں نے صحرا میں چلتے چلتے کچھ دیر کھیل تماشے کے لیے اونچی عمارتوں اور کشادہ سڑکوں کا یہ میلہ سجایا ہے۔ ابھی تھوڑی دیر میں شام ہو جائے گی تو وہ اپنے خیموں سمیت یہ نقلی شہر بھی اکھاڑ کر چلتے بنیں گے، جیسے ساحل پر کھیلنے والے بچے دن بھر گیلی ریت سے گھروندے بنا کر انہیں خشک کرتے ہیں اور پھر شام کو جب ان کی مائیں واپسی کے لیے آواز لگاتی ہیں، تو جاتے جاتے پیروں سے اپنا ہی بنایا شہر مسمار کر کے چلے جاتے ہیں۔ مجھے دینی بھی ایسے چند شرارتی بچوں کا بنایا ہوا عارضی بسا شہر لگ رہا تھا۔ رفیق مجھے جس عالی شان اور لمبی سی گاڑی میں لیے چوڑی سڑکوں پر تیزی سے دوڑے جا رہا تھا، میں نے اس گاڑی کے ڈیش بورڈ پر ہاتھ پھیر کر رفیق سے کہا۔ ”گاڑی تو بڑی کمال ہے، اپنی ہے کیا؟“ رفیق نے زوردار قہقہہ لگایا۔ ”فی الحال نہیں، مگر ایک دن اپنی بھی ہو جائے گی۔ میرے مالک کی گاڑی ہے یہ۔ ہم تو صرف ڈرائیور ہیں۔ مالک کی ڈرائیوری کر کے روزی روٹی کماتے ہیں۔“ گاڑی مختلف راستوں سے ہوتی ہوئی کسی رہائشی علاقے میں داخل ہوگئی، جہاں اونچی اونچی عمارتوں میں بہت سے چھوٹے فلیٹس بھی بنے تھے۔ رفیق اسی علاقے میں رہتا تھا، ہم اس کے چھوٹے سے، مگر صاف ستھرے فلیٹ میں داخل ہوئے، تو اس نے فوراً چائے کا پانی چولہے پر چڑھا دیا۔ ”فریق میں کھانے پینے کا سارا سامان پڑا ہے۔ کھانا گرم کر کے کھا لینا۔ مجھے کچھ دیر میں واپس جانا ہوگا۔ مالک سے صرف دو گھنٹے کی چھٹی لے کر آیا ہوں۔ رات کو باقی باتیں ہوں گی۔“

رفیق لپک جھپک چائے کی پوری پیالی دو گھنٹ میں طلق سے اتار کر وہاں سے چلتا بنا۔ بہت گھلے دل کا تھا رفیق! بالکل استاد مستانہ کی طرح..... مجھے وہ سب یاد آئے، تو میں ایک دم اُداس ہو گیا۔ میں نے زندگی میں کبھی گھر سے باہر اور اتنی دُور وقت نہیں گزارا تھا۔ ہم انسان بھی کتنے زود فراموش ہوتے ہیں، ذرا سی دُوری ہمیں ماضی کا ہر عذاب بھلا کر پھر اُسی ماضی کو یاد کر کے آجیں بھرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ جب میں اپنے گھر میں تھا، تب بھی وہاں میں نے کون سے اچھے دن دیکھے تھے، مگر آج چند ہزار میل کا فاصلہ طے کرتے ہی مجھے اسی گھر اور اپنی گلیوں کی یاد ستانے لگی تھی، جہاں مجھے ہر پل کسی نئی ذلت کا سامنا رہتا تھا۔ جب ایک دن ہمیں یہ سب کچھ چھوڑ ہی جانا ہوتا ہے، تو پھر ہم ان درود یوار، رشتوں، درختوں اور آس پاس کے ماحول سے اتنا جُڑے جاتے ہیں کہ ذرا سی دوری خود ہمیں توڑ کے رکھ دیتی ہے۔ یہ دنیا اگر عارضی پڑاؤ ہے، تو اپنے ساتھ عارضی پن کا احساس لے کر کیوں نہیں آتی۔

اگلے ایک ڈیڑھ ہفتے میں رفیق نے بھاگ دوڑ کر کے مجھے ایک تعمیراتی کمپنی کے ذریعے کام پر لگوا دیا، فی الحال میرے پاس تین ماہ کا کام کرنے کا ویزا تھا، مگر رفیق نے وعدہ کیا تھا کہ وہ اپنے مالک سے میری سفارش کروا کر اسے سال بھر کے ویزے میں تبدیل کروا دے گا اور اگر میں نے محنت اور ایمان داری سے اپنا کام جاری رکھا، تو اس مدت میں سال بہ سال توسیع بھی ہوتی رہے گی۔ مجھے ایک زیرِ تعمیر عمارت کی چند رہیں منزل میں ویلڈنگ پلانٹ پر کام کرنے کی مزدوری ملی تھی۔ میں اور رفیق صبح سویرے اپنے اپنے کاموں پر نکل جاتے اور رات گئے واپسی ہوتی تو عام طور پر دونوں ہی تھکن سے اس قدر پُور ہوتے کہ بات کرنا بھی کسی بھاری بوجھ اٹھانے کے مانند لگتا۔ مینے بھر بعد جب مجھے میری پہلی تنخواہ ملی تو آنکھوں سے آنسو نکل آئے، اپنے ملک کی سال بھر کی کمائی سے بھی کچھ زیادہ روپے میرے مُٹھی میں بند تھے۔ مگر سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ میں ان پیسوں کا کروں گا کیا۔ اُس روز رفیق کو بھی تنخواہ ملی تھی، لہٰذا شام کو اسی خوشی میں وہ مجھے دعائی دیکھانے کے لیے اپنے مالک کی گاڑی مانگ لایا۔ دعائی کی ڈھلتی شام میں تبدیل ہوتی رات، رنگ اور نور کی برسات، ہر چہرہ دُحلا ہوا، ہر عمارت جگمگاتی سی، چمکتے رستے اور خوشیوں سے سرشار جوڑے، ہانپوں میں ہانپیں ڈالے، اس دل رُبا شہر کی ایک اور شام سے زندگی کے جام کشید کرتے خوش نصیب لوگ۔ زندگی صرف سانس لینے کا نام نہیں، اس بات کا احساس مجھے اُس شام ہوا، ہر سانس سے زندگی نچوڑ لینے کو جینا کہتے ہیں، اور ”ہم جیسے مردہ دل کیا خاک جیا کرتے ہیں۔“ رفیق نے مجھے یوں گم صم بیٹھے دیکھا، تو پُچھ نہ رہا۔ ”کیا بات ہے شہزادے..... کہاں کھو گئے ہو؟ شہر کی رونقیں دیکھو۔“ میں نے فوراً چکر کہا۔ ”ایک تو تم

مجھے شہزادہ نہ کہا کرو، مجھے لگتا ہے، باقی سب کی طرح تم بھی میرا مذاق اڑا رہے ہو۔“ رفیق نے مجھے غور سے دیکھا۔ ”تم تو واقعی برامان گئے۔ اچھا چلو، میں تمہارا دل بہلانے کے لیے دعائی کے سب سے بڑے کلب لیے چلتا ہوں۔ ویسے تو وہاں کا داخلہ ٹکٹ ہی ہم دونوں کی سال بھر کی کمائی سے زیادہ کا ہے، مگر میرے مالک کی وجہ سے ہم سے کوئی ٹکٹ کا نہیں پوچھے گا۔“ میں نے حیرت سے رفیق کو دیکھا۔ ”کیوں تمہارے مالک کی جان پہچان ہے کلب والوں سے؟“ ”رفیق زور سے ہنس پڑا۔“ ارے نہیں، وہ کلب بھی میرے مالک ہی کا ہے۔ نہ صرف یہ کلب بلکہ ایسے نہ جانے کتنے کلب اور ہوٹل ہیں میرے مالک کی کمپنی کے پاس۔ کوئی حساب نہیں ہے، اس کی دولت کا۔ کہتے ہیں کہ آج اگر وہ اپنا ہر کام اور کاروبار بند کر کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بھی بیٹھ جائے اور آئندہ ساری زندگی روزانہ لاکھوں درہم اُڑاتا رہے، تب بھی اس کی تسلیں یا قیامت عیش کرتی رہیں گی۔“ رفیق اپنے مالک کے بارے میں بتاتا رہا اور گاڑی ساحل کے کنارے دوڑتی ایک عظیم الشان کلب میں داخل ہو گئی۔ میرے لیے یہ سب کچھ ایک ظلم جیسا تھا، کئی منزلہ عمارت کے لیے ہر منزل پر کار پارکنگ بنائی گئی تھی اور ہر منزل کسی الگ کھیل یا تفریح کے لیے مخصوص تھی۔ عمارت کی لابی اور اندرونی حصوں کو جدید اور خود کار لفٹس کے ذریعے آپس میں جوڑا گیا تھا، عمارت کے اندر ہی ہوٹل، ریسٹوران، سوئمنگ پول، گالف اور اسنو کرکلیئر، شاپنگ پلازا، سنیما، تھیٹر، جوئے خانے، بار، رقص گاہیں، کیفے اور نہ جانے کیا کیا کچھ آباد تھا۔ کلب کیا تھا، پورا ایک شہر تھا، جسے پچاس منزلہ عمارت میں سمو دیا گیا تھا۔ چھت پر فلکی نظام اور مختلف سیاروں اور ستاروں کو دیکھنے والا ایک پورا ہال بنایا گیا تھا، جہاں بڑی بڑی دیوینکل دُور بینوں کے ذریعے چاند ستاروں کا معائنہ کیا جاسکتا تھا، کلب میں نوجوان جوڑوں کی بہتات تھی، ہب اور بار اتنے پُر ہجوم کہ تیل دھرنے کو جگہ نہ تھی، جوئے خانوں اور بڑے کیسینو کے باہر انتظار کرنے والوں کی لمبی قطاریں ہاتھ میں ٹوکن لیے کھڑی تھیں۔ میں نے رفیق سے جب اپنی اس حیرت کا اظہار کیا کہ یہ کلب تو کسی طور ایک اسلامی ملک کا حصہ نہیں لگ رہا تو رفیق نے حسبِ معمول ایک جان دار قہقہہ لگایا اور سر جھٹک کر بولا۔ ”اسلامی ملکوں میں کلب نہیں ہوا کرتے۔ دعائی ایک الگ ہی شہر ہے۔ یہاں تمہیں ہر مذہب کا پیروکار ملے گا۔ اب یہ اُس پیروکار کی مرضی ہے کہ وہ اپنے مذہب کو کس حد تک برتتا ہے۔ عابدوں اور زاہدوں کے لیے مسجدیں کھلی ہیں اور برہمنوں کے لیے شراب خانے، وہ کہتے ہیں ناں۔“ ”رند کے رند رہے، ہاتھ سے جُست نہ گئی۔“ تو بس وہی معاملہ یہاں بھی ہے۔“ کلب کی ہر منزل پر خُسن کے جلوے اس کثرت سے بکھرے تھے کہ انہیں اپنی محدود بصارت میں سمیٹنا کسی بھی انسان کے لیے ناممکن تھا۔ رفیق مجھے کیسینو کے اندر لے گیا اور میں وہاں پیسے کی ریل پیل دیکھ کر چکر اُڑا تو گیا۔ مذہب انسان کو جس چیز سے منع کرتا ہے، جانے اُسی عمل میں انسان کو اتنی کشش کیوں محسوس ہوتی ہے؟ شاید گناہ اور ثواب کا بنیادی فلسفہ ہی یہی ہے اور اسی جبر پر سزا و جزا کا دار و مدار۔ مگر فی الحال تو اس کلب میں لوگ پانے پینک رہے تھے اور قمار بازی کے نشے میں مسحور سزا و جزا کا ہر فلسفہ بھلا کر بس ان لہجوں کو جی رہے تھے، جو انہیں میسر تھے۔ مسئلہ تو مجھ جیسوں کا تھا، جو گناہ کرتے وقت ثواب کی طرح کجی کر جاتے ہیں اور کارِ ثواب بھی ڈر ڈر کر کسی گناہ کی طرح کرتے ہیں۔

ہم کیسینو سے باہر نکل رہے تھے کہ اچانک کلب میں ایک بل چل سی مچ گئی۔ سارا عملہ ایک دم چاق چو بند ہو گیا اور محافظوں کی دوڑیں لگ گئیں، پتا چلا کہ کلب کا مالک اور رفیق کا آقا بہروز کریم وہاں آچکا ہے۔ میں بھی رفیق اور باقی سارے نوکروں کے ساتھ ایک جانب قطار میں کھڑا ہو گیا۔ بہروز ہال میں داخل ہوا تو چاروں طرف سنا سنا سا چھا گیا۔ وہ ڈھلتی عمر کا ایک نفیس سا شخص تھا۔ مغربی لباس میں ملبوس، ہاتھ میں ہوانا کا قیمتی سگار، ہیرے سے جُوی ٹائی پن اور کف لٹکس، امریکی ڈیزائنر سوٹ اور میچنگ جوتے، آنکھوں میں ایک عجیب سی وحشت اور اُداسی، کھویا کھویا سا وہ شخص واقعی کسی عظیم سلطنت کا

سلطان ہی لگ رہا تھا۔ جیسے دولت ہر کسی کو راس نہیں آتی، ویسے ہی امیری بھی ہر کسی کے ساتھ نہیں چلتی، میں نے بہت سے امیروں کو فقیروں سے بدرِ شخصیت لیے پھرتے دیکھا تھا، مگر بہروز کریم پر امارت ٹوٹ کر برستی محسوس ہو رہی تھی، اس کے ارد گرد اسٹاف، منیجرز اور محافظوں کا ایک ہجوم تھا، مگر پھر بھی وہ کلب کے نوکروں کے سلام کا جواب خندہ پیشانی سے دیتے ہوئے آگے بڑھتا رہا۔ رفیق نے مجھے بتایا کہ جس رات بہروز اپنے کسی ہوٹل یا کلب کا دورہ کرتا ہے، وہ رات وہاں کے عملے کے لیے شبِ برأت بن جاتی ہے، کیوں کہ اس رات ان سب کو ایک ماہ کی تن خواہ کے برابر بونس ملتا ہے اور اس مخصوص کلب کی ہر منزل پر موجود کبھی افراد بہروز کے مہمانوں کے طور پر برتے جاتے ہیں، ان کا ہر بل، ہر خرچہ بہروز کی طرف سے ادا کیا جاتا ہے۔ گویا کبھی کے لیے دعوتِ عام ہوتی ہے۔ میں حیرت سے رفیق کی یہ ساری رام کہانی منہ کھولے سن رہا تھا کہ اچانک بہروز ہمارے قریب سے گزرا تو رفیق نے جلدی سے اسے سلام کیا۔ بہروز نے مسکرا کر جواب دیا تو رفیق نے موقعِ غنیمت جان کر تیزی سے میرا ہاتھ پکڑ کے، کھینچ کر قطار میں آگے کر دیا۔ ”یہ میرا دوست پُری زاد ہے مالک..... کچھ دن پہلے ہی پاکستان سے آیا ہے یہاں مزدوری کے لیے۔ اس کا سلام بھی قبول کیجیے۔“ بہروز نے مسکرا کر میری طرف دیکھا۔ ”کیا نام بتایا تم نے.....؟“ میں پُچھ رہا، رفیق نے جلدی سے میرا نام دہرایا۔ ”نُدی زاد مالک۔“ بہروز کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔ ”خوب، اسے کام نہ ملے تو فیکٹری کے منیجر مصطفیٰ کے پاس بھیج دینا۔“ بہروز مختصری بات کر کے آگے بڑھ گیا اور میں حیرت سے رفیق کو دیکھتا رہا۔ ”تمہارا مالک تو اردو بول لیتا ہے۔“ رفیق نے ہنس کر جواب دیا۔ ”دینی میں کبھی عربی نہیں بولتے۔ میرے مالک ہندوستانی مسلمان ہیں۔ تقسیم کے بعد ان کے والدین یہاں دینی آ کر بس گئے تھے، ہم پاکستانی اور ہندوستانی نوکروں سے وہ اردو میں بات کرتے ہیں۔“

کلب سے واپسی پر رفیق مجھے بہروز کریم کی کامیابیوں کی داستانیں سناتا رہا کہ کیسے کامیابی کی سیزھیاں طے کرتے کرتے آج وہ دینی کے بزنس ورلڈ کے آسمان کا تارہ بن چکا ہے۔ بہروز کریم کی اس افسانوی کامیابی سے متعلق بہت سی پُراسرار کہانیاں بھی مشہور تھیں، مثلاً یہ کہ وہ اپنے دشمنوں کو کبھی معاف نہیں کرتا اور اس کے اس وجہہ چہرے کے پیچھے ایک سفاک شخص بٹھپا ہوا ہے، جو اپنی کامیابی کی راہ میں آنے والی ہر شے کو ہنس نہس کر دیتا ہے۔ بہروز کے بارے میں بولتے بولتے اچانک اسٹیئرنگ پر ہاتھ مار کر زور سے ہنس پڑا۔ ”دیکھ لو پُری زادے پیارے..... تمہیں جس نام سے اتنی چو ہے، آج وہی نام میرے مالک سے تمہارے تعارف کا سبب بن گیا۔ ورنہ بہروز صاحب نے آج تک کسی کا نام پلٹ کر دوبارہ نہیں پوچھا۔ وہ کہتے ہیں نا..... خدا نے دنیا میں ہر چھوٹی سے چھوٹی چیز کا بھی کوئی مقصد ضرور رکھا ہے، تو بھائی مجھے تو تمہارے نام کا مقصد آج صاف نظر آ رہا ہے۔“ گھر پہنچنے کے بعد بھی ساری رات میں بہروز کریم کے بارے میں سوچتا رہا۔ کوئی انسان آخر اتنی بے تحاشا دولت کا کیا کرتا ہوگا۔ دولت مندوں کے دن بھی تو ہم غریبوں کی طرح چوبیس گھنٹے ہی کے ہوتے ہیں۔ وہ بھی ہماری طرح سوتے جاگتے ہیں، تو پھر باقی بچے ہوئے چند گھنٹوں کے لیے کسی کے پاس قارون کا خزانہ اور کسی کے ہاتھ خالی کھنڈل کیوں ہوتا ہے۔

اگلے دن رفیق مجھے فیکٹری ایریا میں لے گیا۔ منیجر مصطفیٰ ایک سخت گیر اور اکھڑ مزاج مصری تھا۔ جو سوائے کام کی بات کے، دوسری کوئی بات کرنا پسند نہیں کرتا تھا۔ اس نے رفیق کو سر سے پیر تک گھورا اور عربی میں کچھ کہا۔ اتنے سالوں میں یہاں رہتے رہتے رفیق کی عربی بھی کافی رواں ہو چکی تھی۔ رفیق نے عربی ہی میں میری طرف اشارہ کر کے کچھ کہا۔ مصطفیٰ نے میرے کاغذات طلب کیے اور پانچ منٹ بعد ہی ہم اس کے کمرے کے باہر کھڑے تھے۔ رفیق نے میرے کاندھے پر ہاتھ مار کر کہا۔ ”چل پیارے..... تیرا کام تو بن گیا۔ یہ منیجر تھوڑا سائیڈ ہا آدی ہے، مگر ہے مالک کا خاص بندہ۔ اب یہ تمہارے سارے انتظامات یوں چلکی بجاتے میں کر دے گا۔ میں نے اسے مالک کا حکم پہنچا دیا ہے۔“ اس دن مجھے ایک اور بات پتا چلی کہ بہروز کریم کی سلطنت میں تو سیکڑوں ایسی گاڑیاں ہیں، جیسی ایک رفیق چلاتا ہے۔ خوش قسمتی سے رفیق کچھ عرصے تک بہروز کریم کے ذاتی دفتر کی گاڑی چلاتا رہا تھا، اس لیے بہروز کو رفیق کا چہرہ یاد رہ گیا ہوگا۔ پانچ روز بعد، رفیق نے مصطفیٰ کا دستخط شدہ، فیکٹری کا ایک حکم نامہ میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ مجھے خاصی معقول تن خواہ پر فیکٹری کی رات کی شفٹ میں کام پر لگادیا گیا تھا۔ کام کچھ مشکل نہیں تھا۔ بس لوہے اور دیگر خام مال کا کمپیوٹر میں اندراج کرنا اور سپلائی کے وقت چارٹ بنانا تھا۔ میں رات بھر فیکٹری میں ڈیوٹی دے کر صبح گھر واپس پہنچتا تو رفیق جانے کی تیاری میں ہوتا۔ ہم ایک ساتھ چائے کا ایک ایک کپ حلق سے نیچے انڈیلے اور میس سونے کے لیے اپنے کمرے کی جانب بڑھ جاتا۔ میری راتیں جاگنے اور دن سونے لگے تھے، اُن دنوں مجھے ایک عجیب سا احساس ہوا کہ رات کو انسان کی شخصیت یک سر بدل جاتی ہے، دن کا اُجالا ہماری بہت سی اُن دیکھی صلاحیتوں کو خوابیدہ کر دیتا ہے، جب کہ شام ڈھلنے کے بعد ہم زیادہ رومان پرور، شفاف اور کسی حد تک نڈر بھی ہو جاتے ہیں یا شاید مختلف شخصیات پر اس دن اور رات کے بھید کا کچھ مختلف اثر ہوتا ہوگا۔

میں فیکٹری میں اپنا کام رات کے پہلے پہر ہی میں مکمل کر لیتا تھا۔ پھر میں ہوتا اور صحرا کا تاروں بھرا آسمان، جورات بھر مجھ سے باتیں کرتا۔ میں گھر سے آئے خطوں کا جواب نہیں دیتا تھا، البتہ ہر ماہ ایک معقول رقم انہیں ضرور بھیج دیتا تھا۔ اس رات بھی میں گھر سے آیا ایک خط دیکھ رہا تھا کہ فیکٹری کے پچھلے حصے میں کچھ کھٹ پٹ کی آوازیں سنائی دیں۔ میں تیزی سے پیچھے کی جانب لپکا۔ چند پرانے مزدور کچھ لوہے کی پینیاں ایک گودام میں سنبھال کر رکھ رہے تھے۔ میں نے ان سے تفصیل پوچھنا چاہی تو فوراً میں نے مجھے جھڑک دیا۔ مگر میں خاموش بیٹھنے والا نہیں تھا۔ میں نے تنبیہ کی کہ اگر انہوں نے مجھے تفصیل نہ بتائی، تو میں صبح ہوتے ہی منیجر مصطفیٰ کو اطلاع دے دوں گا۔ اتنے میں پیچھے سے مصطفیٰ کی آواز آئی۔ ”میں یہیں ہوں..... تمہیں کچھ بتانے کی ضرورت نہیں، اور آج تو تمہارا آف تھا۔ تم یہاں کیا کر رہے ہو؟“ سچ تو یہ ہے کہ مصطفیٰ کو وہاں دیکھ کر میں پریشان ہو گیا تھا۔ آج واقعی میری چھٹی تھی۔ مگر ایک ساتھی کے بیمار ہونے کی وجہ سے مجھے اچانک ڈیوٹی پر آنا پڑا۔ میں نے مصطفیٰ کو بتایا کہ شفٹ انچارج کے طور پر یہ میری ڈیوٹی ہے کہ میں ہر چیز کا باقاعدہ اندراج کروں۔ مصطفیٰ نے میری بات لا پرواہی سے ٹال دی۔ ”ٹھیک ہے، تم نے اپنا فرض پورا کیا۔ اب تمہارے انچارج کی حیثیت سے میں تمہیں حکم دے رہا ہوں کہ تم واپس اپنی جگہ پر جا کر بیٹھ جاؤ اور خاموشی سے اپنی شفٹ ختم کر کے پُچ چاپ واپس گھر چلے جاؤ۔“ مصطفیٰ کی آواز کھردری اور لہجہ بہت سخت تھا۔ میں نے اُس وقت ان سب سے بحث کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ مگر میں نے سوچ لیا تھا کہ کسی بھی طرح بہروز کریم تک یہ اطلاع ضرور پہنچاؤں گا۔ چاہے اس کا انجام کچھ بھی ہو۔ بہروز ہفتے میں ایک آدھ بار اس فیکٹری کا دورہ بھی کرتا تھا اور پھر چھٹی رات جب میں نے احاطے کے باہر بہروز کریم کے اسکوڈ کی گاڑیوں کو رکتے دیکھا، تو تیزی سے ہال کے گیٹ پر آ کر کھڑا ہو گیا۔ مصطفیٰ بھی بہروز کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا اسے کام کے بارے میں کچھ تفصیلات بتا رہا تھا۔ مجھے راستے میں کھڑے دیکھ کر مصطفیٰ کچھ پریشان سا ہو گیا تھا۔ جب وہ لوگ راہ داری میں میرے قریب سے گزرے تو میں نے اچانک آگے بڑھ کر بہروز کریم کو براہِ راست مخاطب کر کے کہا۔ ”مجھے آپ سے کچھ ضروری بات کرنی ہے سر!.....“ بہروز نے پلٹ کر میری طرف دیکھا۔ اس کی پیشانی پر بل پڑ گئے تھے۔

(جاری ہے)



.....ہاشم ندیم.....

ہاشم ندیم نوجوان نسل کے پسندیدہ، ملک کے معروف و منفرد رمارا نثر، ناول نگار ہیں۔ ان کے ناولز ”خدا اور محبت“ اور ”بچپن کا دسمبر“ نے بین الاقوامی پذیرائی حاصل کی، توجہ، سنڈے میگزین میں شائع ہونے والے ناول ”عبداللہ“ کو بھی وقت کے پسندیدہ ترین ناول کا درجہ حاصل ہوا۔ انہیں ان کی ادبی خدمات پر حکومت پاکستان نے تمغہ حسن کارکردگی سے نوازا۔ نیز، قلم کے شعبے میں ”عبداللہ“ نامی ایک بین الاقوامی فلم کے تخلیق کار کی حیثیت سے بھی قدم رکھ چکے ہیں۔

”پری زاد“ ایک اچھوتے، حساس اور قدرے مشکل موضوع پر مبنی بہت دل گداز سی تحریر ہے، یہ ایک ایسے شخص کی کٹھا ہے، جسے اک کم صورتی کے عیب کے سبب، اس ظاہر پسند، زر پرست دنیا کے اُن گنت بد صورت رویوں، بد ہیئت آئینوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ناول سے متعلق اپنی آراء سے آگاہ کرنا ہرگز مت بھولیے گا۔ ہمارا پتا وہی پرانا ہے:

ایڈیٹر، ”سنڈے میگزین“ روزنامہ جنگ، شعبہ میگزین، اخبار منزل، آئی آئی چندریگر روڈ، کراچی۔ ای میل:

sundaymagazine@janggroup.com.pk

مصطفیٰ نے مجھے بُری طرح جھاڑ دیا۔ ”تمہیں کسی نے بتایا نہیں کہ مالک بہروز کو آج تک کسی نے یوں بچ راستے میں نہیں روکا، میں تمہیں اسی وقت نوکری سے فارغ کرتا ہوں۔ دفع ہو جاؤ یہاں سے، کل آکر مہینے بھر کی تنخواہ لے جانا۔“ میں نے اطمینان سے مصطفیٰ کی بات سنی۔ ”ٹھیک ہے، میں چلا جاؤں گا۔ مگر مجھے ایک بار مالک سے بات کرنی ہے، یہ بہت ضروری ہے۔“ آس پاس کا عملہ وحشت زدہ سا مجھے یوں گھور رہا تھا، جیسے مجھ سے بڑا احمق انہوں نے اس روئے زمین پر پہلے کبھی نہ دیکھا ہو۔ بہروز نے اطمینان سے اپنا سگارسلاگیا۔ ”ہاں بولو لڑکے..... اگر تمہیں پیسے وغیرہ چاہئیں، تو تم نے واقعی میرا بہت وقت ضائع کیا، اکاؤنٹس والوں سے لے لو۔“ میں نے جلدی سے واضح کیا۔ ”نہیں جناب..... مجھے پیسے نہیں چاہئیں، میں آپ کو کچھ بتانا چاہتا ہوں۔ یہاں اس فیکٹری سے کچھ ایسی ترسیلات بھی ہوتی ہیں، جن کا ریکارڈ نہیں رکھا جاتا۔ میں نے کوشش کی تو مجھے بھی منع کر دیا گیا۔“ میری بات سُن کر مصطفیٰ نے ڈانٹ کر کچھ کہنے کی کوشش کی، مگر بہروز نے ہاتھ اٹھا کر اسے منع کر دیا اور اپنے خاص محافظ فیروز سے کہا۔ ”فیروز خان کچھ دیر بعد اس لڑکے کو میرے دفتر لے آؤ۔“ بہروز حسب معمول مختصر سی بات کر کے وہاں سے آگے بڑھ گیا۔ فیروز نے مجھے گھور کر دیکھا۔ اسے بہروز کے بہت قریب سمجھا جاتا تھا اور وہی بہروز کا محافظ خاص بھی تھا۔ اس کے علاوہ بہروز کسی دوسرے باڈی گارڈ پر اتنا بھروسہ نہیں کرتا تھا۔ فیروز خان ہی اس کی خواب گاہ کے باہر بھی پہرہ دیتا تھا۔ یہ سب کچھ مجھے رفیق پہلے ہی بتا چکا تھا۔ میں نے جب بھی فیروز کو دیکھا، اسے خاموش ہی پایا، شاید اسے بھی اپنے مالک بہروز کریم کی طرح زیادہ بات کرنے کی عادت نہیں تھی۔ رات کی شفٹ کے تمام ملازم فیروز کے ایک اشارے پر دوبارہ اپنے اپنے کام میں جُت گئے۔ کچھ دیر بعد چڑھائی نے آکر فیروز کو بتایا کہ مالک مجھے طلب کر رہے ہیں۔ فیروز نے مجھے آگے بڑھنے کا اشارہ کیا اور ہم دونوں بہروز کے جہازی سائز، عالی شان دفتر میں داخل ہو گئے۔ مصطفیٰ بھی کمرے میں موجود تھا، جانے اس نے میرے بارے میں مالک کو کیا بتایا ہوگا۔ بہروز کریم کے چہرے پر حسب معمول سپاٹ سا تاثر تھا، اس نے غور سے میری طرف دیکھا۔ ”تم تو وہی ہونا، جسے رفیق نے بھرتی کر دیا تھا؟ ہاں کہو، کیا کہنا چاہتے ہو.....؟“ میں نے اس رات کا پورا قصہ بہروز کو سُنا دیا۔ وہ اطمینان سے بیٹھا سگار کے کش لیتا میری بات سُنتا رہا۔ میری بات ختم ہوئی، تو اس نے ایک گہرا سس لے کر میری طرف غور سے دیکھا۔ ”تم جانتے ہو کہ اگر تمہارا لگا یا ہو یہ الزام غلط ثابت ہوا تو نہ صرف تمہاری نوکری جائے گی بلکہ تمہیں غلط بیانی کے الزام میں پولیس کے حوالے بھی کیا جاسکتا ہے۔“ جی..... میں جانتا ہوں، آپ اپنے طور پر تصدیق بھی کروا سکتے ہیں۔“ بہروز کریم نے پلٹ کر اپنے عقب میں مودب کھڑے مصطفیٰ سے براہ راست پوچھا۔ ”کیوں مصطفیٰ! کیا یہ لڑکا سچ کہہ رہا ہے؟“ مصطفیٰ نے ایک لمحہ توقف کر کے میری طرف دیکھا اور پھر دھیرے سے بولا۔ ”جی مالک..... یہ سچ کہہ رہا ہے۔“ میں نے چونک کر مصطفیٰ کی طرف دیکھا، اس کا جواب میری توقع کے بالکل برعکس تھا اور اس سے بھی زیادہ حیرت بہروز کریم کا رد عمل دیکھ کر ہوئی۔ اس نے اطمینان سے سگار کا ایک اور لمبا کش لیا اور مصطفیٰ سے کہا۔ ”ٹھیک ہے مصطفیٰ جاتے ہوئے میرے لیے ایک کپ بلیک کافی کا کہتے جانا۔“ بہروز کو میرا خیال آیا ”لڑکے، تم کافی پیو گے.....؟“ میں نے جلدی سے انکار میں سر ہلایا۔ مصطفیٰ کمرے سے جا چکا تھا۔ میں نے بھی واپسی کے لیے دروازے کا رخ کیا کہ بہروز نے مجھے آواز دے کر روک لیا۔ ”مصطفیٰ میرا خاص آدمی ہے۔ میرے وفاداروں میں سے ایک قریبی وفادار، لیکن مجھے اچھا لگا کہ ابھی وفاداری کی یہ نایاب صنف دنیا سے بالکل ہی ناپید نہیں ہوئی۔ تم نے اپنی نوکری کی پروا کیے، اپنی وفاداری نبھائی۔ میرے ذہن سے تمہارا نام نکل گیا۔ بڑا منفرد سا نام تھا.....؟“ بہروز نے ذہن پر زور ڈالتے ہوئے میری طرف دیکھا۔ میں نے دھیرے سے اپنا نام دہرایا۔ ”پُری زاد“ بہروز مسکرایا ”ہاں..... پُری زاد! میں نے اس دن بھی محسوس کیا تھا کہ تمہیں اپنا نام کچھ خاص پسند نہیں، تو پھر تم یہ نام بدل کیوں نہیں لیتے.....؟“ میں نے بہروز کی طرف دیکھا۔ ”نام بدلنے سے قسمت تو نہیں بدل جائے گی مالک..... ویسے بھی یہ نام مجھے میری اوقات یاد دلاتا رہتا ہے۔“ بہروز نے میری آنکھوں میں جھانکا۔ ”مرد کو اتنا حساس نہیں ہونا چاہیے۔ دہی کس لیے آئے ہو؟“ میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ”بہت سا پیسا کمانے..... آپ کی طرح بہت بڑا آدمی بننے۔“ بہروز کے ہونٹوں پر ایک تلخ سی مسکراہٹ لمحے بھر کو جھلک دکھا کر غائب ہو گئی۔ ”بڑا آدمی.....؟ جانتے ہو لڑکے، یہ میری طرح کے جو بڑے لوگ تمہیں دولت اور ترقی کے آسمان پر چمکتے نظر آتے ہیں، ان سب کو بھی زندگی میں ایک نہ ایک بار تمہاری طرح ایک رات کسی غیر قانونی ترسیل کا پتا چلا ہوتا ہے، فرق صرف اتنا ہے کہ وہ اس کی خبر دینے کے بجائے، اس آلودہ نظام کا حصہ بننے کا فیصلہ کر لیتے ہیں۔“ بہروز کریم اپنی بات ختم کر کے کھڑا ہو گیا اور

باہر جاتے ہوئے لمحے بھر کے لیے میرے پاس رکھا۔ ”گھر جانے سے پہلے اکاؤنٹس سے ملتے جلتا.....“ میں اپنی جگہ گم صم سا کھڑا رہ گیا اور بہروز کمرے سے نکل گیا۔ صبح بھٹی سے پہلے فیکٹری کا اکاؤنٹس میرے پاس آیا اور ایک نوٹوں سے بھرا لفافہ میرے ہاتھ میں تھا گیا۔ اُس روز مجھے پہلی بار پتا چلا کہ بہروز کریم کی اس سلطنت کا اصل دار و مدار کچھ ایسے ہی غیر قانونی دھندوں پر ہے، جن کی خبر باہر والوں کو نہیں۔

رفیق کو جب اس سارے معاملے کا پتا چلا تو وہ مجھ پر بُری طرح برس پڑا کہ آخر مجھے ان کے پھندے میں ٹانگ اڑانے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ اس نے مجھے خبردار کیا کہ ایک بار تو بہروز نے مجھے معاف کر دیا، مگر دوبارہ اگر کبھی ایسا کچھ ہوا، تو وہ میرے ساتھ کوئی رعایت نہیں برتے گا۔ مگر نہ جانے کیوں مجھے دوسرے عملے کے برعکس بہروز کریم سے بالکل بھی خوف محسوس نہیں ہوتا تھا۔ اگلے ہفتے میری ڈیوٹی رات کے بجائے دن کی شفٹ سے تبدیل کر دی گئی۔ مصطفیٰ سے اب بھی میرا گاہے بہ گاہے سامنا ہوتا رہتا، مگر اب اس کے لہجے اور تیور میں وہ پہلے جیسی سختی نہیں رہی تھی۔ اور پھر کچھ دن گزرنے کے بعد ایک شام جب میں فیکٹری سے باہر نکلنے سے پہلے اپنے برقی کارڈ کے ذریعے واپسی کا وقت نوٹ کروا رہا تھا، تب اچانک رات کی شفٹ والے کارکن نے مجھے مصطفیٰ کا پیغام دیا کہ اس نے مجھے مل کر جانے کو کہا ہے۔ میں وہیں گیٹ کے قریب ایک شیڈ کے نیچے مصطفیٰ کا انتظار کرنے لگا۔ مغرب کے بعد مصطفیٰ اپنے محافظوں کے ساتھ وہاں پہنچا اور گاڑی سے اترتے ہی مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ اندر کمرے میں داخل ہونے کے بعد اس نے مجھے کنڈی لگانے کا اشارہ کیا اور اپنے مخصوص کرخت لہجے میں بولا۔ ”جتنا کما رہے ہو، اس پر اکتفا کرنا چاہتے ہو یا پھر کم وقت میں کچھ زیادہ بنانے کی ہمت رکھتے ہو.....؟“ میرا جواب بہت سیدھا تھا۔ ”میرے پاس کھونے کے لیے کچھ خاص نہیں اور میں اپنی ہمت آزمانا چاہتا ہوں۔“ مصطفیٰ نے لمبی بات نہیں کی۔ بس اتنا کہا کہ رات کو ساحل پر کچھ لالچوں پر سامان آئے گا۔ مجھے وہ سامان وصول کر کے بہروز کی ایک دوسری فیکٹری کے گودام تک پہنچانا ہوگا۔ اس کام میں میرے ساتھ چند دوسرے معاون مع چار گاڑیوں اور ڈرائیورز موجود ہوں گے۔ میں نے زیادہ تفصیل میں جائے پناہ ہی بھری۔ مصطفیٰ نے میرا کاندھا تھپتھپایا۔ ”کام مشکل ہے، مگر یاد رکھو، کام یابی ہمیشہ بہادر کا ساتھ دیتی ہے۔ تمہیں یہ سب کچھ قانون کی نظر سے بچ کر کرنا ہوگا اور گرفتاری کی صورت میں تمہارا مالک سے کوئی تعلق ظاہر نہیں ہونا چاہیے۔ امید ہے تم سمجھ گئے ہو گے۔“ میں نے سر ہلایا۔ ”آپ بے فکر رہیں، میری زبان ہمیشہ بند رہے گی۔“

رات ڈھلتے ہی ہم آٹھ لوگ چار بڑی جھپوں میں سوار ڈور دراز کے ایک ویران ساحل پر پہنچ گئے۔ سمندر خاموش اور آسمان تاریک تھا۔ ہم سب اندھیرے میں ایک بڑی چٹان کی اوٹ میں گاڑیاں کھڑی کر کے لالچوں کا انتظار کرنے لگے۔ میرے لیے وہ سات کارندے بالکل اجنبی تھے اور ہم میں سے کوئی بھی آپس میں بات نہیں کر رہا تھا۔ ڈور کہیں سمندر میں لنگر انداز جہاز سے موسیقی اور نو جوان جوڑوں کے گانے بجانے کی آوازیں ہوا کے دوش پر چند لمحوں کے لیے فضا میں بکھر جاتیں اور پھر وہی طویل ستانا ہمیں گھیر لیتا۔ آج 14 فروری کا دن تھا، جسے ساری دنیا میں محبت کے دن کے طور پر منایا جاتا ہے۔ جب میں فلیٹ سے نکل کر ڈیوٹی کے لیے فیکٹری کی طرف آ رہا تھا تو میں نے دینی کے درو دیوار، بازار اور سڑکوں کو سرخ اور سفید رنگ کے غباروں اور پھولوں سے اٹے دیکھا تھا، نو جوان لڑکیاں سرخ لباس میں ادھر ادھر رنگ برنگی تیلیوں کی طرح اڑتی پھر رہی تھیں اور نو جوان سیاہ لباس کے ساتھ گلے میں سرخ اسکارف یا نائی پنے محبت کا دن منانے کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ شاید سمندر میں لنگر انداز جہاز میں بھی ویلنٹائن کی پارٹی جاری تھی۔ کاش! دنیا میں بد صورت لوگوں کا بھی کوئی ویلنٹائن ڈے منایا جاتا۔ یہ ہر تقریب اور تہوار جو محبت سے منسوب ہے، اس پر صرف خوب صورت لوگوں ہی کا قبضہ کیوں جما رہتا ہے۔ اگر خوب صورت لوگ محبت کا دن مناتے ہیں، تو ہم جیسوں کو بھی کوئی نفرت کا دن منانے کی اجازت نہ ہونی چاہیے، کچھ تو ایسا ہو، جو ہم سے بھی منسوب ہو۔ میں جانے کن ایسی سیدھی سوچوں کے بھنور میں گھرا تھا کہ اچانک دور سے چند لالچوں کی مخصوص جلتی بجھتی روشنیاں نظر آنے لگیں۔ شاید یہ کوئی سنگٹل یا خاص اشارہ تھا، جو پہلے سے ساحل والوں کے لیے طے شدہ تھا۔ ہم سب ہوشیار ہو گئے۔ میری گاڑی کے ڈرائیور نے ڈیش بورڈ کھول کر اس میں سے پستل نکال کر میرے حوالے کر دیا۔ میں اسے یہ بھی نہ کہہ سکا کہ مجھے اس کا استعمال نہیں آتا، کچھ دیر میں لالچیں ساحل کے قریب آ گئیں اور ہم سب گاڑیوں سے اتر کر لالچوں کی طرف بڑھے۔ لالچیں ساحل سے لگ چکی تھیں اور ہم ابھی چند قدم کے فاصلے پر تھے کہ اچانک ساحل کا وہ ویران حصہ بڑی بڑی دیوہیکل سرچ لائٹس کی روشنیوں میں جگمگا سا گیا اور ہم سب پل بھر میں اس تیز روشنی میں نہا گئے۔ کوئی لاؤڈ اسپیکر پر زور سے انگریزی میں چلا یا۔ ”کوئی بھی اپنی جگہ سے ہلنے کی کوشش نہ کرے، تم سب کو چاروں طرف سے گھیر لیا گیا ہے۔“ مجھے کچھ سمجھ نہیں آیا کہ یہ سب ہو کیا رہا ہے، پھر ہمارے ساتھیوں میں سے کوئی چلا یا۔ ”بھاگو“ اور اس کے ساتھ ہی ہماری طرف سے تین چار فائر ہوئے اور سرچ لائٹس چھٹا کے سے ٹوٹ گئیں۔ ایک بھکڑی سی جگہ، تیز روشنی کے بعد ایک دم چھا جانے والا اندھیرا عام اندھیرے سے زیادہ سیاہ اور گہرا ہوتا ہے۔ لہذا ہم سب اندھیرے میں گرتے پڑتے اپنی گاڑیوں کی طرف بھاگے، مگر مجھے راستے میں ایک ٹھوکر لگی اور اگلے ہی لمحے میں گیلی ریت پر اوندھے منہ گرا ہوا تھا۔ لوہے کی ایک سرد نال میری کپٹی سے ٹکرائی اور کسی نے پوری قوت سے میرے سر پر پستول کا دستہ مارا۔ اندھیرے کا طوفان میری آنکھوں کی پٹلیوں سے ہوتا داغ کی رگوں میں اتر گیا اور میرے وجود پر موت جیسا سکوت طاری ہو گیا۔ بے ہوشی، شاید نیند کی انتہا ہے اور نیند موت کا ایک چھوٹا وقفہ ہوتی ہے۔

میں بھی کسی ایسے ہی وقفے کے درمیان موت کی صلیب پر لٹک رہا تھا، جب شدید ٹھنڈے پانی کی ایک بو چھاڑنے مجھے کھینچ کر اس صلیب سے نیچے اتار اچھینکا۔ پانی کے دوسرے ریلے کے ساتھ ہی میں ایک جھلکے سے واپس ہوش کی دنیا میں لوٹ آیا۔ میرے ہاتھ پاؤں کسی کھردری رستی کے ساتھ اس قدر مضبوطی سے ایک کرسی کے ساتھ باندھے گئے تھے کہ مجھے وہ خاردار تاریکی رستی اپنے ہاتھوں کی کلائیوں اور پاؤں کے ٹخنوں میں کھینچتی محسوس ہو رہی تھی،

مجھے کرسی پر بٹھا کر میری گردن بھی رستی سے لپیٹ کر کرسی کی پشت سے اس طرح کس کر باندھی گئی تھی کہ میری ذرا سی جنبش سے وہ رستی گردن کے گوشت میں بیوست ہوتی جا رہی تھی۔ وہ ایک اندھیرا سا کمرہ شاید تہہ خانہ تھا۔ میں نے کچھ بولنے کی کوشش کی، مگر میری آواز میرے گلے ہی میں گھٹ کر رہ گئی۔ کچھ دیر میں، میرے عقب میں چند لوگوں کے قدموں کی آہٹ ہوئی اور کسی نے سامنے آ کر میرے چہرے پر ایک زوردار طمانچا رسید کیا اور عربی میں چلا کر کچھ پوچھا۔ پھر میرے جواب دینے سے پہلے ہی دوسرا طمانچا گال پر اپنے نشان ثبت کر گیا۔ میں نے چلا کر کہا کہ میں عربی نہیں بول سکتا، لہذا وہ جو کوئی بھی ہیں، مجھ سے انگریزی میں بات کریں۔ اس بار وہ تینوں اندھیرے سے نکل کر سامنے آ گئے۔ وہ شاید پولیس یا کوئی دوسرے قانون نافذ کرنے والے ادارے کے اہل کار تھے۔ اس بار انہوں نے رابطے کے لیے انگریزی کا سہارا لیا۔ ان کے سوال انتہائی مختصر اور انداز بڑا سفاک تھا۔ وہ چیخ چیخ کر مجھ سے پوچھتے رہے کہ میں کون ہوں، دعویٰ میں کب سے قیام پزیر ہوں اور میرا ان اسمگلرز سے کیا تعلق ہے اور یہ کہ میں کس کے لیے کام کرتا ہوں.....؟ میرے پاس جواب میں سوائے خاموشی کے اور کچھ نہیں تھا اور پھر کوئی چارہ نہ پا کر انہوں نے دھیرے دھیرے اپنے ستم کا دائرہ کار بڑھانا شروع کر دیا۔ میرے بدن کے ہر جوڑے کو لوہے کی ایک چھوٹی سی مخصوص ہتھوڑی سے اس طرح ٹھوکا گیا کہ ہر ضرب روح میں چھید کرتی محسوس ہو رہی تھی۔ جسم کو جلتے سگریٹوں سے وقفے وقفے سے داغا جاتا رہا اور اس تمام عرصے میں مجھے پنجوں کے بل کھڑا کر کے میرے ہاتھ اسی کھردری رستی سے چھت پر ایک کنڈے کے ساتھ باندھ رکھے گئے، اس طرح کہ میرے بازوؤں پر میرے جسم کا سارا بوجھ یوں پڑتا رہا کہ میرے شانوں اور کہنیوں کے جوڑے کھل جائیں۔ وہ ہر بار تشدد کے وقفے میں دوبارہ اپنا سوال دہراتے کہ میں کس کے لیے کام کرتا ہوں؟ میں ہر دفعہ تکلیف اور اذیت کے سمندر سے گزرتے ہوئے ڈوب کر جب ہوش کی حد پار کر کے بے سدا ہو جاتا تو مجھے یہی لگتا تھا کہ میری روح قفس غصری سے پرواز کر گئی ہے اور اب میں دوبارہ کبھی ہوش میں نہیں آؤں گا۔ مگر میرے ستم گر بہت تجربہ کار اور اپنے فن میں ماہر تھے۔ انہیں مجھے زندہ رکھنا آتا تھا اور پھر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ ان میں سے ایک نے تھک کر دوسرے دو جگہ دوں سے کہا کہ اسے ڈر ہے کہ کہیں میں مرنے نہ جاؤں، لہذا ہمیں اسے سلطانی گواہ بنالینا چاہیے اور مجھ سے عدالتی اسٹامپ پیپر پر ایک معاہدہ کر لیا جائے کہ اگر میں انہیں اپنے گروہ یا مالک میں سے کسی ایک کے بارے میں بھی اقبالی بیان دے دوں، تو وہ مجھے اگلے جہاز سے میرے ملک بنا کسی الزام کے ڈی پورٹ کر دیں گے۔ مجھے وہاں قید ہونے کے بعد دو یا تین دن کا حساب تو یاد رہا تھا، مگر پھر اس کے بعد اذیت کی شدت سے میری بے ہوشی کے وقفے اتنے طویل ہونے لگے کہ مجھے دن اور رات کی ہر تیز اور گنتی بھول چکی تھی۔ جانے میرے اندر درد برداشت کرنے کی اتنی سکت کب اور کیسے پیدا ہو گئی تھی۔ شاید ساری عمر زبان کے گھاؤ سہتے سہتے، روح کو بھی اذیت سہنے کی اس قدر عادت ہو گئی تھی کہ جسم پر ہر لمحہ لگتے یہ گھاؤ اور داغ ان روح کے زخموں کے مقابلے میں مجھے بہت کم تر محسوس ہوتے تھے۔ وہ مجھے ہر طرح سے آزما چکے تو آخری حربے کے طور پر انہوں نے میرے ہاتھ اور پاؤں کے ناخن میری کھال سے نوچنے کے لیے خصوصی طور پر تیار کردہ اوزار منگوالیے۔ ان میں سے ایک میرے ہاتھ کھولنے نیچے جھکا تو دوسرے نے بے زاری سے ایک لمبی انگڑائی لی کہ آدھی رات تو بیت ہی چکی ہے تو کیوں ناس ”نیک کام“ کو اگلے روز صبح تک مؤخر کر دیا جائے۔ ویسے بھی میری حالت اس وقت تک اتنی ابتر ہو چکی تھی کہ شاید مجھے اپنے ماس سے ناخنوں کے علیحدہ ہونے کا پتا بھی نہ چلتا۔ کتنی عجیب بات ہے کہ درد اور اذیت محسوس کرنے کے لیے بھی انسان کا اپنے حواس میں رہنا ضروری ہے۔ مجھے اس روز دنیا کے ہر دیوانے اور خرد سے بیگانے شخص کی تقدیر پر ٹوٹ کر رشک آیا۔ نہ دنیا میں کسی درد کا جھمیلہ اور نہ آخرت میں کسی عذاب کا ڈر۔ کاش! اس دیوانے پن کو اختیار کرنا بھی ہمارے اپنے بس میں ہوتا.....

وہ لوگ جانے کس وقت تہہ خانے سے جا چکے تھے، مگر میرا ذہن ابھی تک کسی آزاد جنگلی اور وحشی گھوڑے کی طرح بے لگام دوڑ رہا تھا۔ دفعتاً مجھے یوں محسوس ہوا کہ میری پشت پر بندھے ہاتھوں کی گرفت کچھ ڈھیلی پڑ رہی ہے، شاید کوئی ایک آدھ گره کھلی رہ گئی تھی۔ میں نے کرسی کو دو چار زوردار جھٹکے دینے کی کوشش کی تو منہ سے چیخیں نکل گئیں۔ اذیت، درد اور تکلیف سے دریاؤں کے بند گھل سے گئے اور میرے جسم کے تمام مساموں سے درد یوں قطرہ قطرہ کر کے پھوٹ نکلا، جیسے شدید گرمی کی کڑی دوپہر میں پسینہ پھوٹتا ہے۔ کرسی ایک جانب لڑھک گئی اور میں اس کے ساتھ ہی بندھے ہاتھوں پیروں سمیت زمین پر اوندھے منہ گر گیا۔ کچھ دیر کے لیے تو میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا، جانے کتنی دیر بعد دوبارہ ہوش آیا تو محسوس ہوا کہ کرسی کی ہتھلی ٹوٹ چکی

ہے اور ہاتھ پشت سے تقریباً کھل چکے ہیں۔ میں نے پوری قوت لگا کر ایک جھٹکے سے اپنے ہاتھ آزاد کروائے اور کانپتی، زخمی، خون سے سنی انگلیوں کے ساتھ اپنے پیروں کی بندشیں بھی کھول ڈالیں۔ خود کو کسی نہ کسی طرح گھسیٹتے ہوئے سیز جیوں تک جا پہنچا اور پھر، چاروں ہاتھوں پیروں کی مدد سے جانے کتنی صدیوں میں سیزھیاں چڑھ کر اوپر تہہ خانے کے دروازے تک اپنے گھائل اور پور پور زخمی بدن کو پہنچایا۔ خوش قسمتی سے دروازہ ایک ہلکی سی کنڈی کی مدد سے باہر کی جانب سے بند تھا اور جب میں نے اپنے پورے جسم کے وزن کو دروازے پر دو چار مرتبہ دے مارا تو چھنی گھل گئی اور میں اپنے ہی زور پر، باہر کھلے ہال میں جا گرا۔ میری توقع کے برعکس وہ کوئی جیل یا دفتر کے بجائے ایک ویران سی نامکمل عمارت تھی، جس کے تہہ خانے میں مجھے قید رکھا گیا تھا۔ میں پوری قوت لگا کر لڑکھڑاتا ہوا کھڑا ہو گیا اور اس کوشش میں جانے کتنی بار زمین پر گرا۔ میرے قدم یوں جھولتے ہوئے زمین پر پڑ رہے تھے، جیسے ناگوں میں موجود ہر ہڈی کو پیس کر چکنا چور کر دیا گیا ہو۔ کسی نہ کسی طرح میں زیر تعمیر ہال کے ڈھانچے سے باہر نکلا اور دُور صحن میں نظر آنے والے لوہے کے بڑے گیٹ کی طرف بڑھا۔ میں احاطے کی دیوار کا سہارا لے کر دھیرے دھیرے گیٹ کے قریب پہنچا ہی تھا کہ اچانک صحن اور عمارت کا پورا احاطہ تیز روشنی سے جگمگا اٹھا۔ صرف اندھیرا ہی انسان کی بصارت نہیں چھینتا، کبھی کبھی روشنی کی چکا چوند بھی اندھا کر دیتی ہے۔ میں بھی چند لمحوں کے لیے نابینا سا ہو گیا اور پھر مجھے بہت سے سائے اپنی جانب دوڑتے نظر آئے، میں نے دیوانہ وار گیٹ سے باہر نکلنے کے لیے چھلانگ لگائی، مگر مجھے راستے ہی میں کسی نے دبوچ لیا اور میں اس طرح بے سداہ سازمین پر گر گیا، جیسے سیکڑوں میل صحرا اور جنگل میں لگا تا روڑ نے والا کوئی گھوڑا شدید تھکن سے پھو ہو کر ہانپتے ہوئے آخری بار کبھی نہ اٹھنے کے لیے زمین پر گر جاتا ہے۔ میری پلکیں بوجھل ہو کر دھیرے دھیرے بند ہوتی گئیں۔ شاید میری موت آخر کار مجھے اپنی مہربان آغوش میں لینے کے لیے، پلکوں کے در پر اپنے سفید پنکھ پھیلائے آکھڑی ہوئی تھی۔ مجھے اس موت کی دیوی کی آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔ ”پری زاد..... اٹھو..... چلو بہت دیر ہو گئی.....“ میں نے غور سے آواز سننے کی کوشش کی۔ ہاں، کوئی میرا نام پکارتا تو رہا تھا، مگر یہ آواز.....؟ ہاں، میں اس آواز کو پہچانتا تھا۔ کوئی کسی سے کہہ رہا تھا ”اسے اب ہوش میں لاؤ..... یہ مجھے زندہ چاہیے.....“ میرے ڈوبتے ذہن نے آواز پہچان لی..... یہ بہروز کریم کی آواز تھی۔ تو کیا مجھے بہروز کریم نے خود اغوا کروایا تھا؟

(جاری ہے)

ہاشم ندیم نوجوان نسل کے پسندیدہ، ملکہ کے معروف و منفرد راز مارا نثر، ناول نگار ہیں۔ ان کے ناولز ”خدا اور محبت“ اور ”بچپن کا دسمبر“ نے بین الاقوامی پذیرائی حاصل کی، توجہ، سنڈے میگزین میں شائع ہونے والے ناول ”عبداللہ“ کو بھی وقت کے پسندیدہ ترین ناول کا درجہ حاصل ہوا۔ انہیں ان کی ادبی خدمات پر حکومت پاکستان نے تمغہ حسن کارکردگی سے نوازا۔ نیز، قلم کے شعبے میں ”عبداللہ“ نامی ایک بین الاقوامی قلم کے تخلیق کار کی حیثیت سے بھی قدم رکھ چکے ہیں۔

”پری زاو“ ایک اچھوتے، حساس اور قدرے مشکل موضوع پر مبنی بہت دل گدازی تحریر ہے، یہ ایک ایسے شخص کی کٹھا ہے، جسے اک کم صورتی کے عیب کے سبب، اس ظاہر پسند، زر پرست دنیا کے اُن گنت بد صورت رویوں، بد ہیئت آئینوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ناول سے متعلق اپنی آراء سے آگاہ کرنا ہرگز مت بھولیے گا۔ ہمارا پتا وہی پرانا ہے:

ایڈیٹر، ”سنڈے میگزین“ روزنامہ جنگ، شعبہ میگزین، اخبار منزل، آئی آئی چندریگر روڈ، کراچی۔ ای میل:

sundaymagazine@janggroup.com.pk

بہروز کریم کی آواز سننے ہی میرے خوابیدہ حواس کو ایک جھٹکا سا لگا، مگر پھر میں ہوش کی سفاک سرحدوں کو پار کر گیا۔ میں آج تک یہ نہیں سمجھ پایا تھا کہ یہ سرحدیں کیوں بنائی جاتی ہیں۔ جاوید اختر نے ٹھیک ہی کہا تھا، ”سرحدیں انسانوں کے لیے ہوتی ہیں..... سوچو تم نے اور میں نے، کیا پایا انسان ہو کے.....؟“ میں بھی ایک ایسا ہی بد نصیب انسان تھا۔ پیچھی، ندیا یا پون کا جھونکا ہوتا، تو جانے کب کا اس سفاک دنیا سے پرواز کر چکا ہوتا، مگر میرے بد تو بندھے ہوئے تھے، جتنی بار ہوش آیا، میں نے خود کو سفید بیٹیوں میں بندھے پایا، پھر نہ جانے کتنے دن بعد مجھے تھوڑی دیر کے لیے مکمل ہوش آیا، تو میں ایک آرام دہ کمرے میں ایک نرم بستر پر پڑا تھا۔ ایک نرس میرے قریب بیٹھی مستعدی سے میری دواؤں کا چارٹ بنا رہی تھی، میں نے گھبرا کر اس سے پوچھا۔ ”میں کہاں ہوں.....؟“ تو وہ مسکرا کے بولی۔ ”فکرمات کرو، تم محفوظ ہاتھوں میں ہو..... تمہارے زخم دھیرے دھیرے بھر رہے ہیں، بس تم آرام کرو۔“ نرس کمرے سے نکل گئی اور پھر جتنی دفعہ بھی مجھے ہوش آیا، میں نے اسی نرس اور چند مخصوص چہروں کو اپنے ارد گرد منڈلاتے دیکھا، جو پوری طرح میرا خیال رکھ رہے تھے۔ یہ زخم بھی کتنے بے وفا ہوتے ہیں۔ مسیحائی کا مرہم ملنے ہی کیسے اپنا مسکن، ہمارا یہ جسم چھوڑ جاتے ہیں۔ وہی جسم جو ان زخموں کی خاطر جانے کیسے کیسے درد اور عذاب جھیلتا ہے، یہ اُسی کو بھول جاتے ہیں۔ ان سے اچھے تو ان زخموں کے دیے ہوئے داغ ہوتے ہیں۔ عمر بھر ساتھ تو بھاتے ہیں۔ تقریباً ہفتہ بھر بعد میں اٹھ کر بیٹھنے کے قابل ہو گیا۔ مجھے سب سے زیادہ فکر رفیق کی تھی۔ جانے وہ میری تلاش میں کہاں کہاں بھٹک رہا ہوگا۔ میری دیکھ بھال پر مامور طبی عملہ میرے کسی سوال کا جواب نہیں دیتا تھا یا شاید انہیں واقعی کچھ پتا ہی نہیں تھا اور پھر آٹھویں دن پہلی مرتبہ فیروز خان کا چہرہ نظر آیا۔ وہ میرے کمرے میں داخل ہوا تو میں اٹھ بیٹھا۔ ”یہ سب کیا ہے فیروز..... میں کہاں ہوں، مجھے یہاں کون لایا ہے، مالک کہاں ہیں، کوئی میری بات کا جواب کیوں نہیں دیتا.....؟“ فیروز نے حسب معمول خاموشی سے میرے سارے سوالات سنے اور پھر بہت اطمینان سے بولا۔ ”سب پتا چل جائے گا۔ ویسے تم تو واقعی بہت سخت جان نکلے، ورنہ میرا خیال تھا کہ تم جیسا کچا لڑکا ایک جھٹکے ہی میں ٹوٹ جائے گا۔ مگر زندگی میں پہلی مرتبہ میرا اندازہ غلط ثابت ہوا۔“ میں نے حیرت سے فیروز کی طرف دیکھا۔ ”کیا مطلب، تو کیا تم لوگوں کو خبر تھی کہ مجھ پر کیا گزر رہی ہے، اور مجھے اغوا کر کے کہاں رکھا گیا؟“ فیروز کا چہرہ پھر بے تاثر تھا۔ اس نے جیب سے اپنی مخصوص برانڈ کی بیڑی نکالی اور ہونٹوں میں داب کر سلگائی۔ ”ہاں، نہ صرف جگہ کا پتا تھا، بلکہ تمہیں یہاں اٹھا کر لانے والے بھی ہمارے ہی آدمی تھے۔“ میرے دماغ کا تو جیسے فیوزی اُڑ گیا، میں نے چلا کر کہا۔ ”مگر کیوں، میرے ساتھ یہ سب کچھ کیوں کیا گیا.....؟“ فیروز کا لہجہ اب بھی دھیمہ اور بے سکون تھا۔ ”تم ہی نے تو مالک سے کہا تھا کہ تمہیں بہت پیسا کمانا ہے۔ یہ پیسا کمانے کی پہلی کسوٹی تھی۔ تم کیا سمجھتے ہو کہ ہم اتنے ہی پاگل ہیں کہ ایک دن راہ چلتے تمہیں ہسپتال تھا کر کروڑوں ریال کا مال لینے ساحل پر بھیج دیں گے، پیسا کمانے کے لیے صرف کلائی کی نہیں، کلیجے کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ تمہاری برداشت، حوصلے اور بہادری کا امتحان تھا۔ ہم میں سے جو بھی مالک کے خاص کارندے ہیں، انہیں اسی طرح کی کئی آزمائشوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ ہاں، مگر تم پر مالک نے کچھ زیادہ ہی سخت ہاتھ رکھا۔“ میں منہ کھولے حیرت سے فیروز کی بات سن رہا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ ساحل پر ہونے والے ڈرامے سے لے کر میرے فرار کی کوشش تک سب ہی پہلے سے طے شدہ تھا۔ مجھے بہروز کریم کے خاص گروہ میں شامل کرنے سے پہلے انہیں میری وفاداری کا ہر طرح سے امتحان لینا تھا۔ فیروز کے مطابق اگر میں کسی بھی مرحلے پر ہار کر اپنی زبان کھول دیتا، تو اسی لمحے مجھے اس اذیت خانے سے نکال کر پہلی فلائٹ سے ڈی پورٹ کر دیا جاتا۔ مجھے فرار کا موقع بھی جان بوجھ کر دیا گیا تھا، کیوں کہ بہروز یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ کہیں میں درد سے ٹوٹ کر اپنی ہمت اور حوصلہ تو نہیں کھو بیٹھا۔ فیروز نے مجھے یہ بھی بتایا کہ ایسی ساری کارروائیوں کی براہ راست نگرانی خود بہروز کریم کرتا ہے، کیوں کہ اُسے اپنے ارد گرد صرف ایسے خاص چٹے ہوئے وفاداروں کا گروہ چاہیے ہوتا ہے، جو اس کے ہر امتحان پر پورا اترے۔ میں نے فیروز سے رفیق کے بارے میں پوچھا تو اس نے تسلی رکھنے کو کہا کہ رفیق کو اتنا ہی پتا ہے کہ مجھے مالک نے کسی ضروری کام سے ابوظہبی کے دفتر بھیج دیا ہے اور اس عرصے میں وہ لوگ میری طرف سے رفیق کو میرے گھر بھیجنے کے لیے پیسے بھی دیتے رہے ہیں۔ وہیں بیٹھے بیٹھے فیروز نے اپنے فون پر میری رفیق سے بات بھی کروادی۔ میری آواز سن کر رفیق کھل سا گیا۔ ”اوئے کہاں ہو تم یار! ایسی بھی کیا نوکری، یاروں کو ہی بھلا دیا۔“ میری آواز بھرا سی گئی۔ مگر میں نے صرف اتنا کہا کہ میں جلد ہی واپس آ کر تم سے ملوں گا۔ اور پھر فیروز کے جانے کے بعد میں نے تھک کر آنکھیں موند لیں۔

اس دن مجھے احساس ہوا کہ دنیا میں انسان دولت، روپیا، پیسا، سب کچھ کما لیتا ہے، مگر سب سے مشکل کسی کی وفاداری کمانا ہے کہ اس کا تعلق کسی دوسرے کے خلوص اور ایمان سے ہوتا ہے۔ بہروز کریم کی یہ احتیاط اور پریشانی اپنی جگہ بجا تھی۔ سلطنت بنالینے سے کہیں زیادہ مشکل، سلطنت کو قائم رکھنا ہوتا ہے۔ دنیا کے بڑے بڑے شہنشاہ بہت چھوٹے اور معمولی غداروں کے ہاتھوں اپنی بادشاہت گنوا چکے ہیں اور بہروز کریم مجھے تاریخ یاد رکھنے والا شخص معلوم ہوتا تھا۔ شام کو اچانک باہر وہی ہلچل سی مچ گئی، جو بہروز کی آمد کا خاصہ اور ابتدائی پیغام لے کر آتی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد بہروز میرے کمرے میں موجود تھا، فیروز خان بھی اس کے ساتھ آیا تھا۔ میں نے کھڑے ہونے کی کوشش کی تو بہروز نے مجھے بیٹھے رہنے کا اشارہ کیا اور خود بستر کے سامنے پڑی کرسی پر بیٹھ

کرنے کے لیے رائج طریقہ ہے۔ انسان کا جسم ہی بظاہر اس کی سب سے بڑی کم زوری اور مجبوری ہوتا ہے۔ تو اگر آپ نے بھی کم زوری کو آزما کر وفاداری کی جانچ کی تو کیسا لگہ شکوہ.....؟“ بہروز نے دل جھسی سے پوچھا۔ ”خوب! گویا وفاداری پر کھنے کا کوئی اور طریقہ بھی ہوتا ہے، میں بھی جانا چاہوں گا۔“ ”جس وفادار کے لیے اس کا جسم اور درد کم زوری ہو، اس کے لیے برداشت کی جانچ ہی سب سے آزمودہ طریقہ ہے، مگر جسے درہنہ اور اذیت برداشت کرنے کی عادت پڑ چکی ہے، اس کا امتحان کیا ہوگا؟“ بہروز پُچ رہا۔ میں نے اپنی بات جاری رکھی۔ ”اس دنیا میں ہر انسان کے لیے قدرت نے ایک الگ امتحان تیار کر رکھا ہے۔ کہیں درد، کہیں دولت، کہیں خُسن اور کہیں اقتدار، آپ نے تو ابھی مجھے صرف ایک آزمائش سے گزارا ہے، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ میرے حصے کا امتحان ہی نہ ہو.....؟“ بہروز نے اپنے سگار کو بے خیالی میں توڑا اور فیروز خان نے جلدی سے لائٹر سے سگار کو شعلہ دکھایا۔ ”تم ٹھیک کہہ رہے ہو، مگر میں اپنے وفاداروں کو اتنا کچھ دے دیتا ہوں کہ انہیں اور کسی چیز کی حسرت ہی نہیں رہتی، لیکن ایک بات تمہاری دل کو لگتی ہے۔ واقعی وفاداروں کی وفانا پنے کا کوئی حتمی پیمانہ ایجاد ہی نہیں ہوا کبھی۔ انسان کے خون ہی میں وفانا نہ ہو تو یہ صرف دل بہلاوے کی آزمائشیں ہیں۔ مجھے تمہاری صاف گوئی پسند آئی اور مجھے تمہاری قوتِ برداشت کی بھی داد دینی پڑے گی، حالاں کہ دیکھنے میں تم اتنے سخت جان نہیں لگتے۔ بہر حال، اب تم بھی ہماری ٹیم کا حصہ بن چکے ہو۔ مگر یاد رہے، جس دنیا میں تم قدم رکھنے جا رہے ہو، وہاں سے واپسی کا کوئی دروازہ نہیں۔ میں کبھی خود کسی کو یہ پیش کش نہیں کرتا، مگر تم اگر چاہو تو میں آج بھی تمہیں بہت کچھ دے کر واپس تمہارے ملک رخصت کر سکتا ہوں۔ مگر ایک بار جب تم ہمارے راز اور ٹھکانوں سے واقف ہو گئے، تو پھر تمہاری واپسی کبھی ممکن نہیں ہوگی۔ چاہو تو میں تمہیں سوچنے کے لیے دودن مزید دے سکتا ہوں۔“ ”میں واپس جانے کے لیے یہاں نہیں آیا تھا۔ یہاں آنے سے پہلے ہی میں اپنے واپسی کے سارے راستے بند کر چکا ہوں، اور واپسی کی فکر وہ کرتے ہیں، جن کی واپسی کا کوئی منتظر ہو۔ میرا کوئی آگے ہے نہ پیچھے۔ آپ حکم کریں، مجھے کیا کرنا ہوگا؟“ بہروز نے اطمینان سے میری بات سُنی اور پھر کاندھا تھپتھپاتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ ”پہلے تم مکمل صحت یاب ہو جاؤ، پھر بہت کام پڑے ہیں تمہارے کرنے کے۔ اور ہاں، کچھ دن بعد تمہارے دوست کو یہاں سے کسی بہتر جگہ ٹرانسفر کر دیا جائے گا، کیوں کہ یہاں سے واپسی کے بعد تم اس کے ساتھ نہیں رہو گے۔“ بہروز کریم کمرے سے باہر نکل گیا۔

فیروز خان کچھ حیرت زدہ سا تھا، وہ ایک لمحے کے لیے میرے پاس رُکا۔ ”تم واقعی بہت خوش قسمت ہو، کھڑے مالک کو میں نے آج تک اتنی باتیں کسی سے کرتے نہیں دیکھا۔ جلدی تند درست ہو کر باہر آنا، تمہارے ساتھ مل کر کام کرنے میں مزہ آئے گا۔“ فیروز چلا گیا اور اس کے ٹھیک ایک ہفتے بعد جب میں رفیق کے فلیٹ پہنچا تو وہ اپنا سامان باندھ رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر مجھ سے لپٹ گیا ”اچھا ہوا تم آگئے، مجھے مالک نے انچارج بنا کر ابوظہبی والی فیکٹری میں ٹرانسفر کر دیا ہے۔ پر تم فکر نہ کرنا، میں نے مالک سے التجا کی ہے کہ وہ تمہیں بھی جلدی ترقی دے کر میرے پاس بھجوادے۔ تب تک تم یہیں میرے فلیٹ میں رہو گے۔“ میں خاموش رہا۔ اب میں اسے کیا بتاتا کہ ہمارے راستے جدا ہو چکے ہیں۔ میں رفیق کو رخصت کرنے اور پورٹ تک اس کے ساتھ آیا اور جہاز فضا میں بلند ہونے تک باہر لاؤنچ میں کھڑا رہا۔ ہماری زندگی میں کچھ ایسے لوگ بھی آتے ہیں، جن کی موجودگی سے کہیں زیادہ ہمیں ان کی غیر حاضری محسوس ہوتی ہے۔ رفیق کے جانے کے بعد میں نے اسے زیادہ قریب پایا۔ ہم انسان اتنے کوتاہ نظر کیوں ہوتے ہیں؟ اپنے قریب کی چیزیں، رشتے، ناتے اور لوگ ہمیں کیوں نظر نہیں آتے، جب کہ ان ہی جذبوں اور رشتوں کی تلاش میں ہم سات سمندر پار تک ساری دنیا چھان لیتے ہیں، مجھے تو ایسے بھی دو چار دن میں بہروز کریم کی طرف سے دیے گئے نئے اپارٹمنٹ میں شفٹ ہو جانا تھا، مگر رفیق کے جانے کے بعد مجھ سے چوبیس گھنٹے بھی اُس فلیٹ میں نہیں رہا گیا۔ میں نے فیروز کو کھلوا بھیجا کہ ہو سکے تو مجھے چند دن کے لیے کسی ہوٹل میں منتقل کروادے۔ جواب میں فیروز نے شام تک ایک بڑے فرسٹڈ اپارٹمنٹ کی چابی میرے حوالے کر دی۔ جہازی ساز کے اس اپارٹمنٹ میں ضرورت کی ہر شے پہلے سے موجود تھی۔ ہر چیز نئی، قیمتی اور چمکتی ہوئی۔ قرینے سے سجائی گئی۔ اتنی بڑی خواب گاہ، جس کی کھڑکی سمندر کی طرف کھلتی تھی۔ دبیز ایرانی قالین، رئیسی پردے، فانوس، بڑے بڑے مصوروں کی تصویروں سے سجی دیواریں، ساتویں منزل پر بنے ہوئے اس اپارٹمنٹ کا سمندر کی طرف کھلنے والا میسر اور وہاں پڑی وہ بید کی قیمتی آرام کرسی..... پل بھر کے لیے مجھے اپنے گھر کی چھت پر بنا وہ گودام نما چھوٹا سا کمر یاد آ گیا اور میری آنکھیں بھیگ گئیں۔ اس چھوٹے سے ڈربے نما کمرے سے لے کر اس عالی شان اپارٹمنٹ کے سفر میں نہ جانے میں نے پایا زیادہ تھا یا کھویا بہت۔ مجھے ابھی تک یہ نہیں بتایا گیا تھا کہ مجھے کام کیا کرنا ہوگا۔ مگر ایک بات تو بہت حد تک واضح ہو چکی تھی کہ بہروز کریم کے کچھ ایسے خفیہ دھندے بھی ہیں، جو قانون کی نظر سے چُھپ کر جاری تھے۔ فیروز سے مجھے اتنا ضرور پتا چل گیا تھا کہ وہ لوگ درپردہ سونے کی اسمگلنگ کا کاروبار کرتے تھے، یہ دولت کمانا بھی تو ایک خطہ ہے۔ شاید دنیا کا سب سے بڑا خطہ اور جنون، ورنہ بہروز کریم کو بھلا مزید روپیا کمانے کی کیا ضرورت تھی۔ یا شاید یہ بھی ایک نشہ ہے۔ کچھ لوگ خرچ کر کے اس نشے کا سُور و محسوس کرتے ہیں اور کچھ جمع کر کے۔ اسی روز مجھے ایک اور ادراک بھی ہوا کہ دولت مند کی دولت جتنی بڑھتی جاتی ہے، وہ اتنا ہی اپنے اندر سے خود کو غیر محفوظ تصور کرنے لگتا ہے اور ٹھیک اس کے برعکس فقیر کا فقر اور فاقہ جتنا زیادہ بڑھتا ہے، وہ اتنا ہی بہادر اور لا پرواہ ہوتا جاتا ہے۔ میں بھی جب تک فقیر تھا، مجھے اپنی جھلنگ چار پائی پر بھی جھولتے جھولتے نیند آ جاتی تھی اور آج جب میرے پاس دعویٰ کے سب سے پوش علاقے میں مہنگا ترین اپارٹمنٹ موجود تھا، تو میں اپنی خواب گاہ کی نرم مسہری پر ساری رات بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا۔

اگلی صبح سویرے ہی فیروز خان کا پیغام آ گیا کہ بہروز کچھ دن کے لیے شہر سے باہر جا رہا ہے۔ اور جانے سے پہلے اس نے ہم سب کو کسی خاص میٹنگ

کے لیے اپنے ساحل والے بنگلے پر بلایا ہے۔ سہ پہر کو ڈرائیور گاڑی لے آیا اور مجھے اور دو چار مزید ارکان کو لیے وہ بہروز کریم کی شاہانہ رہائش گاہ پر پہنچ گیا۔ میں نے اس سے پہلے یہ جگہ نہیں دیکھی تھی۔ میرا اندازہ درست تھا۔ بہروز کو صرف کماتا نہیں، خرچ کرنا بھی آتا تھا اور اس نے اپنی اس رہائش گاہ پر جی بھر کے خرچ کیا تھا۔ کہتے ہیں انسان کا خط اور اس کی رہائش کا سلیقہ، اس کے اندر کے آدمی کی نزاکت یا کزنگی ظاہر کرتے ہیں۔ بہروز کریم کا یہ عالی شان محل اس مثال کی غمازی کر رہا تھا۔ اندر داخل ہوتے ہی ایک جانب پورچ میں دنیا کی چند بہترین اور مہنگی ترین گاڑیاں شیڈ کے نیچے کھڑی تھیں۔ شاید بہروز کو دنیا کی نایاب ترین کاریں جمع کرنے کا شوق تھا۔ دائیں جانب چھوٹی سی پانی کی ایک نہر تھی، جس سے پرے، ہنرے پر ایک وسیع و عریض گالف کورس بنایا گیا تھا۔ گھاس کے اونچے نیچے ٹیلوں کی پشت پر جہاں وہ پتھر اور درختوں کے ٹھنڈے ختم ہوتے تھے، وہاں ٹینس کورٹ بھی تھا، مگر گاڑی ہم سب کو لیے ان سب عجوبوں کو پار کرتی شیشے اور لکڑی کی ایک خوب صورت عمارت کی طرف بڑھتی گئی، جو شاید بہروز کے بنگلے کی انیکسی تھی، کیوں کہ اصل گھر جو کسی برطانوی دور کے قلعے سے مشابہ تھا، اس کی سرخ اور بھوری اینٹوں سے بنی عمارت تو ان سب سے پرے دکھائی دے رہی تھی۔ ہم سب انیکسی میں داخل ہوئے تو بہروز اور فیروز خان پہلے سے وہاں موجود تھے۔ بہروز نے مجھ سمیت سب کا حال پوچھا اور پھر ہمیں بتایا کہ اسے اچانک ایک ضروری کام سے چند دن کے لیے لندن جانا پڑ رہا ہے۔ اور اس کی واپسی ہفتہ بھر میں متوقع ہے۔ پھر اس نے فیروز کو اس عرصے میں سبھی ارکان کی ڈیوٹی کے بارے میں تفصیل بتانے کی ہدایت کی، فیروز نے سب کو مختلف ادھورے کام اور وہ سودے بتائے، جو اس عرصے میں انہیں پایہ تکمیل تک پہنچانے تھے۔ مگر میرے لیے اس تفصیل میں کوئی فرض شامل نہیں تھا۔ باقی سب رکن ایک ایک کر کے وہاں سے رخصت ہوتے گئے اور پھر آخر میں صرف میں ہی کھڑا رہ گیا۔ بہروز کریم نے مسکرا کر فیروز سے پوچھا ”کیوں فیروز خان اپنی زاد سے تمہاری بہت دوستی ہوگئی ہے کیا، اسے کوئی کام نہیں دیا تم نے؟“ فیروز خان نے حسب معمول سپاٹ چہرے کے ساتھ جواب دیا ”یہ ابھی نیا ہے مالک..... اور اسے کوئی پرانا سودا بھی نہیں چکانا۔ آپ خود ہی اس کے لیے کوئی کام بتادیں۔“ بہروز نے اپنا مخصوص سگار نکالا اور فیروز نے لائٹر سے اسے سلگایا۔ ”ہاں اس کے لیے میرے پاس ایک خاص کام ہے، تم جانتے ہو پوری زاد، تم میرے گروپ کے سب سے نئے رکن ہو۔ اس لیے میرے کاروباری حریفوں اور میرے دشمنوں کی اب تک تم پر نظر بھی نہیں پڑی ہے۔ تمہاری اسی خصوصیت کو میں اس ایک ہفتے میں بروئے کار لانا چاہتا ہوں۔“ میں نے سر جھکا کر کہا ”میں آپ کے حکم کا منتظر ہوں۔“ بہروز نے مجھے بتایا کہ اس نے یہ محل اپنی چوتھی بیوی کے لیے تعمیر کروایا ہے، جو اس کی سب سے زیادہ لاڈلی بھی ہے۔ اس کی باقی دو بیگمات یہیں دہلی میں اور ایک بیوی اور چھوٹا بیٹا لندن میں رہتے تھے۔ وہ لندن اپنے اسی بیٹے کا کسی نام ور تعلیمی ادارے میں داخلہ کروانے کی غرض سے جا رہا تھا، لیکن اسے اپنی اس نئی کم سن دلہن کی بہت زیادہ فکر لگی رہتی تھی۔ اسی لیے بہروز نے اس محل میں اس کی تفریح کا ہر سامان مہیا کر رکھا تھا۔ اس کے دشمنوں کو ابھی بہروز کریم کی اس نئی شادی کا علم نہیں تھا۔ نہ ہی وہ کریم کی نئی نویلی دلہن کی صورت سے واقف تھے۔ مگر بہروز کے بقول اس کی گھر والی اب گھر میں بیٹھے بیٹھے اوب چکی تھی، لہذا وہ اپنی سہیلیوں اور خاندان سے ملنے کے لیے باہر جانے کی ضد کرنے لگی تھی۔ بہروز اس کی محبت کے ہاتھوں انتہائی مجبور ہونے کے باوجود اسے اپنے کسی پرانے وفادار یا محافظ کے ساتھ باہر نہیں بھیجنا چاہتا تھا۔ کیوں کہ بہروز کے پرانے وفاداروں کو پورا شہر جانتا تھا کہ ان کے ساتھ کا مطلب ہی بہروز کے خاندان کی نشان دہی تھا۔ لہذا بہروز چاہتا تھا کہ اس کی غیر موجودگی میں اگر اس کی دلہن کو کہیں جانا ہو تو میں بھی ڈرائیور کے ساتھ اس کے ساتھ جاؤں، دوسری احتیاط مجھے یہ بھی کرنی تھی کہ بہروز کی دلہن کو کسی گاڑ کی موجودگی کی الجھن سے بے بھی بے خبر رکھوں کہ اسے اس زیر زمین دنیا کے خطرات سے آگاہ کر کے بہروز اس کی زندگی اجیرن نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ہاں، البتہ جس گاڑی میں، میں ڈرائیور اور بہروز کی وہ لاڈلی گھر سے نکلیں گے، اس کے تعاقب میں بہروز کے خاص وفادار محافظوں کی ایک ٹیم غیر محسوس طور پر ضرور رہے گی۔ اس دوسری گاڑی کا صرف مجھے پتا ہوگا اور ان کمانڈوز سے فون پر میرا رابطہ رہے گا تا کہ جب کبھی میں کوئی خطرہ محسوس کروں تو وہ پلک جھپکتے ہی گاڑی کو اپنی حفاظت کے حصار میں لے لیں۔ پوری بات کہنے کے بعد بہروز نے تصدیق کے لیے میری طرف دیکھا ”سب سمجھ گئے ناں، کوئی بات پوچھنی ہو تو پوچھ سکتے ہو۔ مگر یاد رکھنا، لیلیٰ صبا میری جان ہے۔ اسے ہلکی سی کھروچ بھی آئی تو اچھا نہیں ہوگا۔ تمہارے پاس غلطی کی کوئی گنجائش نہیں ہے پوری زاد۔“ میں نے سر ہلایا ”نہیں مالک! میں اچھی طرح سمجھ گیا ہوں۔ کوئی غلطی نہیں ہوگی۔“ بہروز مسکرایا ”شاہاش! تم ظاہر نہیں کرتے، مگر کافی ذہین ہو۔“ میں پچ رہا، مگر نہ جانے کیوں مجھے اس ساری کہانی میں کوئی ایک چیز بار بار الجھا رہی تھی، جیسے بہروز نے سب کچھ بتاتے ہوئے بھی کچھ بہت خاص چھپا لیا ہو، جیسے کوئی بہت بڑا راز میرے آس پاس بھٹک کر میرے کان میں کوئی سرگوشی کر کے کچھ بتانے کی کوشش کر رہا ہو، پر بتانہ پار ہا ہو۔

کچھ دیر میں ایک ملازم نے آکر بتایا کہ لیلیٰ صبا جاگ چکی ہیں اور کریم کا پوچھ رہی ہیں۔ بہروز کریم نے اٹھتے ہوئے مجھے بھی اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ ”تم بھی وہیں آ جاؤ، میں تمہارا تعارف بھی لیلیٰ سے کروا دیتا ہوں۔“ میں بہروز کریم اور فیروز کے نقش قدم پر چلتا ہوا اس محل کے ہال نما لاونج میں داخل ہوا تو ایک جانب رکھے نفیس اور خوب صورت سفید رنگ کے پیانو کو دیکھ کر میرے قدم ٹھٹھک سے گئے۔ مجھے یاد آیا کہ بچپن میں، میں بھی تو ایک پیانست بننا چاہتا تھا اور آج قدرت نے پیانو دکھایا بھی تو کہاں.....؟ اتنے میں اوپر کی منزل کی طرف سے نیچے آتی لکڑی کی سیڑھیوں پر کسی کے نازک قدموں کی آواز گونجی، میری نظریں خود بہ خود جھٹک گئیں، آنے والی نزاکت سے پاؤں دھرتے نیچے اُترتی تو بہروز نے مجھ سے کہا ”ان سے ملو پوری زاد، یہ ہیں میری بیگم۔ اس گھر کی مالکن، لیلیٰ صبا۔“ میں نے جھپکتے ہوئے نظر اٹھائی اور مجھ پر جیسے ایک پل کے لیے بجلی سی گئی۔

(جاری ہے)



.....ہاشم ندیم.....

ہاشم ندیم نوجوان نسل کے پسندیدہ، ملکہ کے معروف و منفرد ڈراما رائٹر، ناول نگار ہیں۔ ان کے ناولز ”خدا اور محبت“ اور ”بچپن کا دسمبر“ نے بین الاقوامی پذیرائی حاصل کی، تو جنگ، سنڈے میگزین میں شائع ہونے والے ناول ”عبداللہ“ کو بھی وقت کے پسندیدہ ترین ناول کا درجہ حاصل ہوا۔ انہیں ان کی ادبی خدمات پر حکومت پاکستان نے تمغہ حسن کارکردگی سے نوازا۔ نیز، فلم کے شعبے میں ”عبداللہ“ نامی ایک بین الاقوامی فلم کے تخلیق کار کی حیثیت سے بھی قدم رکھ چکے ہیں۔

”پری زاد“ ایک اچھوتے، حساس اور قدرے مشکل موضوع پر مبنی بہت دل گدازی تحریر ہے، یہ ایک ایسے شخص کی کہتا ہے، جسے اک کم صورتی کے عیب کے سبب، اس ظاہر پسند، زر پرست دنیا کے اُن گنت بد صورت رویوں، بد ہیئت آئینوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ناول سے متعلق اپنی آراء سے آگاہ کرنا ہرگز مت بھولے گا۔ ہمارا پتا وہی پرانا ہے:

ایڈیٹر، ”سنڈے میگزین“ روزنامہ جنگ، شعبہ میگزین، اخبار منزل، آئی آئی چندریگر روڈ، کراچی۔ ای میل:

sundaymagazine@janggroup.com.pk

میں نے لیلیٰ صبا کو دیکھا تو چند لمحوں کے لیے تو جیسے پتھر کا ہو گیا۔ بہروز کریم کو خدا نے صرف روپے پیسے ہی سے نہیں نوازا تھا، لیلیٰ صبا کی صورت حسن کی ایک انمول نعمت بھی عطا کر رکھی تھی۔ لیلیٰ حسن و نزاکت کا ایک مکمل امتزاج تھی۔ مغربی لباس میں ملبوس، سیاہ فلپیر کے اوپر میرون شرٹ اور گلے میں سیاہ اسکارف، گھلے بال اور بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں نیند کا خمار..... بہروز کریم کی فکر اپنی جگہ بالکل بجا تھی۔ اس گل رخ کی حفاظت کے لیے سارے دینی کو بھی مامور کر دیا جاتا، تو کم تھا۔ کریم نے لیلیٰ سے میرا تعارف کروایا ”اس سے ملو، یہ پری زاد ہے، میرا نیا اسٹنٹ.....“ میں نے چونک کر بہروز کی طرف دیکھا، وہ لیلیٰ سے اردو میں بات کر رہا تھا۔ لیلیٰ نے نخوت سے میری طرف دیکھا اور انگریزی میں بہروز سے کہا ”او کم آن آغا، آپ کی پسند کو کیا ہوتا جا رہا ہے؟“ بہروز نے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور انگریزی ہی میں مجھے لاؤنچ کے ساتھ ملحق دوسرے کمرے میں انتظار کرنے کو کہا۔ شاید وہ لیلیٰ کو یہ جتنا ناچاہ رہا تھا کہ میں انگریزی جانتا ہوں۔ میں چپ چاپ وہاں سے نکل آیا، مگر لیلیٰ اور کریم کی اونچی آواز میں بحث میرے کانوں تک پہنچتی رہی۔ خاص طور پر جب کریم نے لیلیٰ کو یہ بتایا کہ اب میں گھر سے باہر نکلتے وقت ہمیشہ لیلیٰ کے ساتھ رہوں گا، تو لیلیٰ کی آواز مزید اونچی ہو گئی ”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں آغا، اب یہ شخص میرا سایہ بن رہا ہے گا.....؟ آپ یہ تو سوچیں کہ جب یہ میرے ساتھ چلے گا تو میرا کتنا مذاق بنے گا، اس سے تو بہتر ہے کہ میں گھر سے باہر ہی نہ نکلوں۔“ بہروز کریم نے اپنے مخصوص شہنشاہی لہجے میں بیوی کو سمجھایا کہ میرا اس کے ساتھ باہر جانا کیوں ناگزیر ہے، اور یہ کہ وہ یہ سب کچھ لیلیٰ کی محبت میں کر رہا ہے، ورنہ وہ پردیس جا کر بھی لیلیٰ کی طرف سے پریشانی میں مبتلا رہے گا۔ بہر حال، ایک لمبی بحث و تکرار کے بعد آخر کار وہ لیلیٰ کو معاملے کی نزاکت سمجھانے میں کامیاب ہو گیا۔ اس دن مجھے احساس ہوا کہ محبت کا رنگ کتنا طاقت ور ہوتا ہے کہ جو بہروز کریم جیسے فو لاد کو بھی بھر پور مٹی میں تبدیل کر سکتا ہے۔ مجھے نیا حکم یہ ملا کہ میں اپنا ضروری سامان لے کر انیکسی منتقل ہو جاؤں، تاکہ اگر کبھی لیلیٰ کو اچانک باہر جانا ہو تو اسے میرا انتظار نہ کرنا پڑے۔ مگر میری الجھن بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ بہ ظاہر یہ سیدھا سادہ نظر آنے والا معاملہ مجھے بہت میز حاد کھائی دے رہا تھا۔ جانے کیوں مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ بات صرف لیلیٰ کی حفاظت سے کہیں بڑھ کر ہے اور پھر میرے اس خدشے کی تصدیق بھی جلد ہی ہو گئی، جب انٹرپورٹ روانگی سے قبل بہروز نے مجھے بلا کر سختی سے تاکید کی کہ گھر سے باہر مجھے ہر لمحہ لیلیٰ کے ساتھ رہنا ہوگا اور روزانہ کی رپورٹ دینی ہوگی۔

بہروز کے لندن جانے سے پہلے میں انیکسی میں منتقل ہو چکا تھا۔ فیروز نے لیلیٰ کے اردو بولنے کا معنا بھی حل کر دیا کہ دراصل لیلیٰ ترکی سے تعلق رکھتی ہے اور بہروز نے اسے وہیں استنبول کے ایک میلے میں دیکھا اور اس پر دل ہار بیٹھا۔ لیلیٰ نے بہروز کی محبت میں اردو سیکھی اور اب وہ ٹوٹی پھوٹی اردو بول بھی لیتی ہے۔ یہ ان کی شادی کا دوسرا سال تھا، مگر میں بد قسمتی سے پہلے روز ہی لیلیٰ صبا کی نظروں میں ایک ناپسندیدہ شخص قرار پا چکا تھا، کیوں کہ اسے بہروز کے لگائے ہوئے پہرے سے شدید چڑ ہو گئی تھی اور اس کی جھنجھلاہٹ کا سارا نزلہ مجھ ہی پر گرنا تھا، لیکن اگر بہروز یہ حکم نہ بھی دیتا، تب بھی لیلیٰ جیسی ماہ رخ کی مجھ جیسے بد صورت شخص سے نفرت لازمی تھی۔ خاص طور پر اُس وقت، جب اس شخص کی ہم سفری کی شرط بھی لازمی قرار دے دی گئی ہو۔ میں انیکسی میں اپنے کمرے میں آرام کری پر بیٹھا بہت دیر تک سامنے دیوار میں لگے بڑے آئینے کو دیکھتا رہا۔ مجھے آئینے پسند نہیں تھے۔ مگر ہر گھر میں، ہر دیوار پر لگے یہ شیشے ہر پل میرا راستہ کاٹتے رہتے تھے۔ اور گھر ہی پر کیا منحصر، باہر گلی میں، سڑک پر، گاڑیوں میں، عمارتوں کے اندر ہر طرف میرے یہ دشمن میری تاک میں گھات لگائے بیٹھے رہتے تھے۔ میں کہاں کہاں ان سے بچ پاتا۔ سارے شہر میں جاہ جاہ میرا منہ چڑانے اور مذاق اڑانے کے لیے کھڑے ملتے۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ اگر زندگی میں کبھی مجھے اپنا گھر بنانے کا موقع ملا تو اس میں کسی آئینے کی جگہ نہیں ہوگی۔ کوئی گوشہ تو اس دنیا میں ایسا ہو، جہاں میں ہنسی خوف اور جھجک صرف اپنے ساتھ رہ سکوں۔

اگلے روز سہ پہر تین بجے کے قریب مجھے گھر کے ملازم نے آکر حکم سنایا کہ مالکن باہر جانا چاہتی ہیں اور ڈرائیور باہر پورچ میں میرا انتظار کر رہا ہے۔ میں گاڑی کے قریب پہنچا تو لیلیٰ صبا غصے میں بھری کھڑی تھی ”اتنی دیر کہاں لگا دی تم نے، کیا اب مجھے تمہاری تیاری کا انتظار بھی کرنا پڑے گا؟“ میں نے اسے بتایا کہ مجھے ملازم نے صرف تین منٹ پہلے روانگی کا بتایا ہے اور میں جس حالت میں بیٹھا تھا، ویسے ہی چلا آیا ہوں۔ مگر لیلیٰ نے میری بات پوری ہی نہیں ہونے دی اور جھڑک دیا۔ ”اچھا اچھا..... ٹھیک ہے، اب گاڑی میں بیٹھو، میں کسی فضول بحث کے موڈ میں نہیں ہوں“ میں چپ چاپ ڈرائیور کے ساتھ آگے بیٹھ گیا اور لیلیٰ نے عربی میں ڈرائیور سے کہیں چلنے کو کہا۔ گاڑی دینی کی بارونق سڑکوں سے ہوتی ایک جدید طرز کی کالونی میں داخل ہو گئی، جہاں اونچے اونچے پُر قیوش اپارٹمنٹس کی بہت سی قطاریں تھیں۔ ہماری گاڑی ”بے“ سیریز کے اپارٹمنٹس کی قطار کے سامنے آکر رک گئی۔ لیلیٰ نیچے اُتری تو میں بھی نیچے اُتر آیا۔ اس نے غصے سے میری طرف دیکھا۔ ”تم کہاں اُتر آئے..... میںیں نیچے میرا انتظار کرو، میں اپنی سیٹیلی سے مل کر آتی ہوں“ میں نے سر جھکا کر جواب دیا ”مجھے آپ کو اکیلا نہ چھوڑنے کا حکم ہے۔ میں آپ کی سیٹیلی کے اپارٹمنٹ تک ساتھ چلوں گا۔“ لیلیٰ میری بات سننے ہی آپے سے باہر

ہوگئی۔ ”ہاؤ، ڈیرے..... تمہاری ہمت کیسے ہوئی مجھے پلٹ کر جواب دینے کی۔ اپنی اوقات میں رہو ورنہ.....“ اس بار مجھے اپنا لہجہ سخت کرنا پڑا۔ ”معافی چاہتا ہوں مگر یہ مالک کا حکم ہے“ ہمارے تعاقب میں آنے والے گارڈز کی گاڑی کچھ فاصلے پر کھڑی ہو چکی تھی، اور مجھے ان کی بے چینی سے ایسا محسوس ہو رہا تھا، جیسے انہیں ہمارا یہاں زیادہ دیر رکنا کچھ پریشان کر رہا ہے۔ لیلیٰ غصے سے دانت چست، پیر پختی اندر لٹھ کی جانب بڑھ گئی۔ پندرہویں منزل پر لیلیٰ کی دوست کا اپارٹمنٹ تھا۔ اُس نے اپارٹمنٹ کا دروازہ کھولا تو دونوں سہیلیاں یوں ملیں، جیسے برسوں بعد ملاقات ہوئی ہو۔ لیلیٰ اندر چلی گئی اور میں باہر راہ داری میں ایک جانب دیوار کے ساتھ لگے لوہے کے بیچ پر بیٹھ گیا۔ تقریباً دو گھنٹے بعد وہ دونوں باہر نکلیں۔ لیلیٰ نے قریبی شہر کی مارکیٹ سے کچھ خریداری کی اور ہم اُس کی سیکلی کو اپارٹمنٹ کے باہر چھوڑ کر واپس گھر چلے آئے۔ لیلیٰ نے گاڑی سے اترتے ہی چیخ کر فیروز خان کو حاضر ہونے کا حکم دیا اور غصے میں بھری اندر چلی گئی۔ میں انیکسی میں آکر بستر پر دراز ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد فیروز خان بھی وہاں نازل ہو گیا۔ ”تمہاری، مالکن سے کوئی بحث ہوئی تھی آج.....؟“ ”ہاں، وہ اکیلے جانے کی ضد کر رہی تھیں، میں نے صرف مالک کے حکم کی تعمیل کی۔“ فیروز نے ایک لمبی سانس بھری، آئندہ ایسی نوبت نہ آئے، تو بہتر ہے۔ لیلیٰ مالکن، مالک کی بہت چڑھتی ہیں۔ وہ یہ سب برداشت نہیں کریں گے۔ یوں سمجھ لو کہ تم ایک دودھاری تلوار پر چل رہے ہو اور تمہیں دونوں جانب ہی اپنا وزن برابر رکھنا ہے، ورنہ کٹ کر دو حصوں میں تقسیم ہو جاؤ گے۔“ فیروز جاتے جاتے مجھے ایک نئی الجھن میں مبتلا کر گیا تھا۔ اگر میں بہروز کریم کا حکم مانتا تو لیلیٰ کی ناراضی یقینی تھی، اور اگر لیلیٰ کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے اس سے دُور رہتا اور مکمل نگرانی نہ کرتا تو بہروز کی حکم عدولی ہوتی اور دونوں صورتوں میں سزا میری ہی مقدرتھی۔

شام ڈھلتے ہی گھر کے ہال سے پیانو کی مدھرتائیں ابھرنے لگیں۔ کوئی پیانو پر بہت خوب صورت دُھن بجا رہا تھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی میرے قدم ہال کی جانب بڑھ گئے۔ ایک بوڑھی انگریز استانی پیانو بجاتے ہوئے لیلیٰ کو پیانو کا سبق دے رہی تھی۔ میں نے لاؤنچ کی کھڑکی سے ہال کے اندر کا منظر دیکھا تو اُلٹے قدموں واپس چلا آیا۔ گویا لیلیٰ کو بھی پیانو سیکھنے کا شوق تھا۔ چلو، ایک بات تو ثابت ہوئی کہ کم از کم خوب صورت اور بد صورت لوگوں کے اندر ایک سادہ ہوتا ہے۔ ورنہ میں تو آج تک یہی سمجھتا رہا کہ بد صورت لوگوں کا دل شاید کچھ کم دھڑکتا ہوگا۔ اگلے روز لیلیٰ صبح سویرے ہی کہیں جانے کے لیے تیار کھڑی تھی۔ شاید ڈرائیور تک بہروز کریم کی ہدایات پہنچادی گئی تھیں۔ ورنہ لیلیٰ کا بس چلنا تو وہ اکیلی ہی ڈرائیور کے ساتھ نکل چکی ہوتی۔ آج لیلیٰ نے مجھ سے زیادہ بحث نہیں کی اور ڈرائیور سے جمیرا کی طرف چلنے کے لیے کہا اور خواہ مخواہ شام تک ماڑی میں خریداری کرتی رہی۔ جانے یہ امیر عورتوں کو شاپنگ کا انتخاب کیوں ہوتا ہے؟ شاید یہ بھی ایک طرح کی بھوک ہوتی ہے۔ اور یہ بھوک صرف بھرے پیٹ ہی لگتی ہے۔ شام کو گھر واپسی کے بعد میرے کان نہ چاہتے ہوئے بھی پیانو کی اس خوب صورت دُھن کی آس کرنے لگے، سماعت کو بھی تو کبھی کبھی بہت شدید بھوک محسوس ہے۔ خاص طور پر مجھ جیسوں کی سماعت کو کہ جو ساری عمر کسی کی زبان سے دو ٹوٹے بول سننے کو ترستی رہی۔ اور پھر، ہماری سماعت انسانوں کی زبان سے مایوس ہو کر قدرت کی بکھیری دیگر آوازوں میں اپنے حصے کی چاشنی ڈھونڈنے لگتی ہے۔ مجھے بہتے پانی کی آواز، بارش کی خاموش بوندوں کی ٹپ ٹپ، سرسراتی ہوا، جھرنوں اور ایسی میٹھی دُھنوں کی سرگوشیاں ہمیشہ اپنی جانب کھینچتی تھی۔ سو، جب پیانو کے لئے چھڑی، تو میں بے اختیار انیکسی سے نکل آیا اور باہر باغیچے میں، لاؤنچ کی کھڑکیوں کے آس پاس ٹہلنے لگا۔ جانے کتنی دیر بعد اندر سے آواز آنا بند ہوئی اور بوڑھی پیانو ٹیچر سر پر اسکارف ٹھیک کرتے ہوئے باہر نکلی اور گیٹ کی طرف چل پڑی۔ میں نے جلدی سے آگے بڑھ کر اسے سلام کیا اور بہروز کے خادم کی حیثیت سے اپنا تعارف کروایا۔ وہ خوش دلی سے مسکادی۔ اس کا نام مارتھا تھا، میں نے مارتھا سے درخواست کی کہ کیا وہ مجھے بھی پیانو بجانا سکھا سکتی ہے، میں اسے پورا معاوضہ دینے پر بھی تیار تھا، مگر مارتھا کے چہرے پر مایوسی کی لکیریں ابھر آئیں۔ اس نے مجھے بتایا کہ اس کے پاس اپنا پیانو نہیں ہے۔ وہ تو کرپین کالونی میں رہتی ہے۔ اور اسکول کے بچوں اور شام کو ایک دو بڑے گھروں میں پیانو سکھا کر اپنا گزارہ کرتی ہے۔ اس کی بات سُن کر میری امیدوں پر اوس گر گئی۔ پھر کسی خیال سے میری آنکھیں جھپکیں، ”اگر میں کبھی اپنا پیانو لے سکوں تو کیا آپ مجھے سکھانے آئیں گی؟“ مارتھا میرا سوال سُن کر زور سے ہنس پڑی ”ہاں ہاں، کیوں نہیں، بلکہ تمہارا شوق دیکھتے ہوئے میں تمہاری فیس بھی آدھی کر دوں گی۔“ مارتھا ہنستے ہوئے وہاں سے چلی گئی اور میرے دل میں یہ خواب پلنے لگا کہ جانے کب میں اپنا پیانو خریدوں گا اور مارتھا سے پہلا سبق دوں گا۔

اب میرے پاس اچھی خاصی رقم ہر ماہ جمع ہو جاتی تھی۔ پیانو خریدنا میرے لیے کوئی خاص بڑا مسئلہ نہیں تھا۔ مگر انیکسی میں پیانو رکھنے کی اجازت شاید مجھے نہ مل پاتی۔ ساری رات میں یہی سوچ سوچ کر کروٹیں بدلتا رہا کہ ایسی کیا تدبیر کروں کہ میری برسوں کی دہلی خواہش پوری ہو سکے۔ جب خواب روٹھ جائیں تو راتیں بڑی طویل ہو جاتی ہیں۔ انسان بھی عجب ہے، خواب دیکھے، تو راتوں پر فریب دینے، جال بننے کا الزام لگا دیتا ہے۔ اور خواب نہ آئیں تو اُسی رات کی طوالت سے اُسے بے زاری ہونے لگتی ہے۔ میں بھی اس طویل رات کے بعد صبح اٹھا، تو سُر درد سے پھٹ رہا تھا، بستر چھوڑنے کو بالکل بھی من نہیں کر رہا تھا، مگر دس بجتے ہی مالکن کا پیغام آ گیا۔ نوکری یا غلامی کی ایک تعریف شاید اپنے اندر کو چکنا بھی ہے۔ کسی طرح اٹھ کر منہ پر دو چار چھینٹے مارے اور سوجی آنکھوں کے ساتھ پورچ میں پہنچ گیا۔ مگر توقع کے برعکس ابھی تک وہاں کوئی گاڑی رواگئی کے لیے تیار نہیں تھی۔ البتہ دوسری گاڑی میں محافظ چاق چوہندا اور تیار بیٹھے تھے۔

کچھ دیر میں اندر سے ایک خادمہ باہر آئی اور اس نے بتایا کہ مالکن اندر لاؤنچ میں مجھے یاد کر رہی ہیں۔ میں الجھا ہوا سالانچ کی جانب بڑھ گیا۔ جانے اب کیا آفت آنے والی تھی، لیلیٰ کے مزاج کا کچھ بھروسہ نہیں تھا۔ اور یہ بات ابھی تحقیق طلب تھی کہ یہ خلل کثرتِ حُسن کی وجہ سے تھا یا کثرتِ زر کے سبب، کیوں کہ یہ دونوں ہی اپنے اندر دماغی فور پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ مگر جب میں ہال میں داخل ہوا تو خلافِ معمول لیلیٰ بڑی پُرسکون سی پیانو کے قریب بیٹھی اس کے تاروں سے کھیل رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس نے زور سے پیانو کی کلوں پر ہاتھ پھیرا اور مجھ سے کہا ”تمہیں پیانو بہت پسند ہے، بجانا سیکھنا چاہتے ہو.....؟“ میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا، وہ مسکرائی، ”میں نے کل شام تمہاری اور مارتھا کی گفتگو سُن لی تھی۔ تم چاہو تو اسی پیانو پر مارتھا سے سیکھ سکتے ہو، تمہارے مالک سے اجازت میں تمہیں لے دوں گی۔ وہ میری کوئی بات نہیں نالتے“ میرا جی چاہا کہ اس سے پوچھوں کہ اس کرم خاص اور مہربانی کی کوئی وجہ بھی تو بتائیں۔ اس نے شاید خود ہی میری آنکھوں میں لکھا سوال پڑھ لیا۔ ”ہاں مگر بدلے میں تمہیں بھی مجھ سے کچھ تعاون کرنا

پڑے گا۔“ کیساتعاون، میں کچھ سمجھا نہیں.....“ وہ سر جھٹک کر بولی۔“ جب سے میں اس محل میں آئی ہوں، مجھے یوں لگتا ہے، جیسے کسی قید خانے میں آگئی ہوں، بہروز مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں، بہت خیال رکھتے ہیں میرا۔ مگر میرے لیے ان کا یہ خوف اور احتیاط کی انتہا کبھی کبھی میرا دم گھونٹنے لگتی ہے۔ میں اپنی ہم عمر سہیلیوں سے ملنا چاہتی ہوں، ان کے ساتھ شہر میں گھومنا چاہتی ہوں، وہاں ترکی میں تو ہمیں کسی تعلیمی کی طرح اُڑتی پھرتی تھی، مگر یہاں مجھ پر بڑے پہرے ہیں۔“ میں نے دھیرے سے سر جھٹکے جواب دیا۔“ یہ سب آپ ہی کی حفاظت کی خاطر کیا گیا ہے۔ مالک کے دشمن بہت ہیں۔ جو ہر پل انہیں نقصان پہنچانے کی تاک میں لگے رہتے ہیں۔“ لیلیٰ نے اُداسی سے ایک سر د آہ بھری ”جانتی ہوں میں، لیکن کیا تم نہیں سمجھتے کہ اس طرح پہروں میں نکلنے سے میں آغا کے دشمنوں کی نظر میں زیادہ نمایاں ہو جاؤں گی۔ اگر میں اسکارف اور نقاب کے ساتھ سارا دن بھی شہر میں گھومتی پھروں تو مجھے کوئی نہیں پہچان سکے گا۔“ میں نے بے بسی سے اس ضدی لڑکی کی طرف دیکھا۔“ آپ مجھ سے کیا چاہتی ہیں؟“ لیلیٰ نے غور سے میری طرف دیکھا، میری نظر خود بخود تھک گئی۔“ میں صرف اتنا چاہتی ہوں کہ تم یوں دم چھٹا بن کر میرے ساتھ نہ پھرا کرو۔ میری سہیلیاں کتنا مذاق اڑاتی ہیں، میں تمہیں بتا نہیں سکتی۔“ میری نظر بے اختیار اٹھ گئی۔ لیلیٰ نے جلدی سے بات جوڑی ”میری بات کا غلط مطلب مت لینا۔ میں تمہارا مذاق نہیں اُڑا رہی۔ مگر جب ہم ساتھ چلتے ہیں، تو مذاق بن ہی جاتا ہے۔ میں صرف اتنا چاہتی ہوں کہ تم دکھاوے کے لیے میرے ساتھ گھر سے نکلا ضرور کرو، مگر کسی مال یا شاپنگ پلازا میں، میں اسکارف اور نقاب پہن کر اپنا حلیہ بدل لیا کروں گی۔ تم وہیں کسی کینے میں بیٹھ کر میرا انتظار کیا کرنا، اور میں اپنی سہیلیوں کے ساتھ گھوم پھر کر دوبارہ وہیں آجایا کروں گی، لیکن ہم دونوں گھرا یسے ہی آیا کریں گے، جیسے تم مستقل میرے ساتھ تھے۔ آغا بہروز کو اطمینان رہے گا، تمہارا بھرم بھی سب یہ قائم رہے گا، اور میں بھی کچھ گھنٹوں کے لیے ان ساری زنجیروں سے آزاد ہو کر اپنی زندگی جی لیا کروں گی..... بولو، میرا ساتھ دو گے پُر ی زاد.....؟“ اپنا نام لیلیٰ صبا کی زبان سے سُن کر میں زور سے چونکا۔ اس نے اب تک کبھی مجھے یوں براہ راست نام لے کر مخاطب نہیں کیا تھا۔ کچھ لہجے، کچھ بولیاں کچھ تلفظ اور کچھ لہجوں کی ایک جنبش ہی سے عام سے حرف، لفظ اور نام کتنے معتبر ہو جاتے ہیں۔ میرا دل بھی کتنا پاگل تھا، پل بھر ہی میں یہ بھول گیا کہ کل تک یہی عورت مجھے کس نفرت اور حقارت سے پکار رہی ہے، مگر میں اب تک اس لہجہ بدلنے کے فن اور ہنر سے ناواقف ہی تھا۔ لہذا میرا جواب بھی سیدھا سادہ سا تھا۔ ”شاید مالک میرا یوں لاؤنچ میں بیٹھ کر پیانو یکھنا پسند نہ کریں۔ میری حدود اس لاؤنچ سے باہر تک ہیں۔“ لیلیٰ نے اس مسئلے کا حل بھی چٹکیوں میں نکال لیا۔ ”کوئی بات نہیں، تم اپنی انیکسی میں پیانو رکھوا سکتے ہو۔ اس کا انتظام بھی ہو جائے گا۔ میں آج ہی تمہارے لیے ایک نیا پیانو بک کروا دیتی ہوں۔ ویسے بھی بہت عرصے سے انیکسی کی نئی ترین وائرلش کا سوچ رہی تھی۔ اسی بہانے یہ کام بھی ہو جائے گا۔“ جواب میں کہنے کے لیے میرے پاس اب کچھ نہیں بچا تھا۔

اگلے دو دن کے اندر انیکسی کو الٹ پلٹ کر رکھ دیا گیا، نیارنگ، نئے پردے، قالین، پینٹنگز، آرائش اور سب سے بڑھ کر سیاہ رنگ کا ایک بڑا سا خوب صورت پیانو، جب کاری گروہ پیانو انیکسی کے ہال میں رکھوا کر اس کی فٹنگ کر رہے تھے، تو میں وہیں بیٹھا اپنے ایک دیرینہ خواب کو پورا ہوتے دیکھ رہا تھا۔ خواب حقیقت میں ڈھلنے لگیں تب بھی بہت دیر تک ہمیں خواب ہی لگتے ہیں۔ شاید انسان سدا کا بے اعتبار ہے یا پھر مجھ جیسے، جن کے خواب، سدا خواب ہی رہتے ہیں۔ اُسی شام مار تھانے مجھے ایک گھنٹے کی ٹیوشن میں پیانو کی بنیادی کھوں اور سُروں کے بارے میں پہلی کلاس دی، اور تیسرے دن میری انگلیوں نے پہلی مرتبہ کسی ڈھن کو چھیڑا۔ اس درمیان لیلیٰ دومرتبہ گھر سے باہر نکلی اور شہر کے وسط میں واقع ایک کثیر المنز لہ شاپنگ مال میں داخل ہو کر اس نے اپنے منصوبے کے مطابق خود کو اسکارف اور نقاب سے ڈھانپ لیا۔ میں وہیں ایک کینے میں بیٹھا اس کا انتظار کرتا رہا اور قریباً تین چار گھنٹے کے درمیان وہ واپس لوٹ آئی۔ اس مال کے دونوں طرف آنے اور جانے کے راستے واقع تھے اور لیلیٰ نے باہر نکلنے کے لیے پچھلے راستے کا انتخاب کیا تھا، پھر ایک دن کے وقفے کے بعد وہ اپنی اُسی سہیلی سے ملنے کے لیے گئی، جہاں میں بھی ایک بار اُس کے ساتھ جا چکا تھا، مگر اس بار اس نے مجھے نچلے فلور پر پرکھنے کا اشارہ کیا اور خود دفعت کے ذریعے اوپر چلی گئی۔ بہروز کے واپس آنے میں ابھی دو دن باقی تھے۔ میں نے لیلیٰ کی بات مان تو لی تھی، مگر میں اندر سے نہ جانے کیوں ایک عجیب سی بے چینی محسوس کر رہا تھا، میں جانتا تھا کہ میں بہروز کا حکم نہ مان کر بہت بُرا کر رہا ہوں، مگر لیلیٰ کی آزادی کی خواہش بھی مجھے جائز ہی لگ رہی تھی، عجیب کش مکش جاری تھی میرے دل و دماغ کے درمیان۔ دل کہتا تھا کہ لیلیٰ کا ساتھ دے کر میں نے کچھ غلط نہیں کیا، مگر دماغ کچھ الگ ہی راگ الاپ رہا تھا۔ جانے یہ دل اور دماغ نامی دو سکونوں کی آپس میں کبھی جیتی کیوں نہیں۔ اور پھر، جب اس شش و پنج نے جب مجھے پوری طرح نڈھال کر دیا، تو تیسرے دن لیلیٰ کے مال سے نکلنے سے پہلے ہی میں ایک فیصلے پر پہنچ چکا تھا۔ لیلیٰ جیسے ہی مال کے پچھلے دروازے سے باہر نکلی، میں بھی کینے سے نکل کر اس کے پیچھے چل پڑا۔ لیلیٰ نے خود کو ایک لمبی سی عبا یا سے ڈھانپ رکھا تھا، وہ سڑک پار کر کے دوسری جانب بنے ایک پارکنگ میں پہنچی، جہاں پہلے سے ایک سیاہ لینڈ کروزر نائپ گاڑی اس کا انتظار کر رہی تھی۔

یہ گاڑی میں پہلے بھی لیلیٰ کی دوست کے پارٹنر کے نیچے کھڑی دیکھ چکا تھا، مطلب لیلیٰ اپنی اُسی دوست سے ملنے جا رہی تھی یا اس کے ساتھ مل کر کہیں اور گھومنے جا رہی تھی۔ میں نے فوراً قریب سے گزرتی انیکسی کو ہاتھ دیا اور اُسے آگے جاتی سیاہ گاڑی کے پیچھے چلنے کو کہا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ میں لیلیٰ کو بتائے بغیر اس کی نگرانی جاری رکھوں گا، اس طرح میری الجھن کا حل بھی نکل آئے گا اور لیلیٰ کو بھی میری وجہ سے اپنی سہیلیوں اور رشتے داروں کے سامنے شرمندہ نہیں ہونا پڑے گا۔ وہی کی سڑکوں کا ہجوم اور انیکسی کے لیے مقررہ رفتار کی حد ہماری گاڑی کی راہ میں حائل تھی۔ مگر ہم پھر بھی کسی نہ کسی طرح اس سیاہ بڑی گاڑی کا پیچھا کرتے رہے۔ لیکن، پھر ایک سنگل کے اچانک بند ہونے کی وجہ سے لیلیٰ کی گاڑی نظروں کے سامنے ہی دور ہوتی ہوئی، اوجھل ہو گئی۔ سنگل کھلنے کے بعد انیکسی ڈرائیور نے پوری کوشش کی کہ ہم دوبارہ اسے پکڑ سکیں، مگر ناکام رہے۔ تھک ہار کر ہم دوبارہ اُسی مال کے باہر آ کر رک گئے، جہاں سے میں نے انیکسی پکڑی تھی۔ مجھے کینے میں دو گھنٹے انتظار کرنا پڑا، تب کہیں جا کر لیلیٰ کی صورت، دکھائی دی۔ وہ بہت خوش نظر آ رہی تھی، ہم واپس گھر پہنچے تو لیلیٰ اتر کر اندر چلی گئی اور میں نے انیکسی کی جانب قدم بڑھائے ہی تھے کہ میرے عقب میں ایک گرج دار آواز گونجی، اتنی دیر کہاں لگا دی تم لوگوں نے.....؟ میں گھبرا کر واپس پلٹا، کچھ فاصلے پر بہروز کریم کھڑا مجھے گھور رہا تھا۔

(جاری ہے)



.....ہاشم ندیم.....

ہاشم ندیم نوجوان نسل کے پسندیدہ، نٹک کے معروف و منفرد راما رائٹر، ناول نگار ہیں۔ ان کے ناولز ”خدا اور محبت“ اور ”بچپن کا دبسمبر“ نے بین الاقوامی پذیرائی حاصل کی، توجہ، سنڈے میگزین میں شائع ہونے والے ناول ”عبداللہ“ کو بھی وقت کے پسندیدہ ترین ناول کا درجہ حاصل ہوا۔ انہیں ان کی ادبی خدمات پر حکومت پاکستان نے تمغہ حسن کارکردگی سے نوازا۔ نیز، فلم کے شعبے میں ”عبداللہ“ نامی ایک بین الاقوامی فلم کے تخلیق کار کی حیثیت سے بھی قدم رکھ چکے ہیں۔

”پری زاد“ ایک اچھوتے، حساس اور قدرے مشکل موضوع پر مبنی بہت دل گداز سی تحریر ہے، یہ ایک ایسے شخص کی کہتا ہے، جسے اک کم صورتی کے عیب کے سبب، اس ظاہر پسند، زر پرست دنیا کے اُن گنت بد صورت رویوں، بد ہیئت آئینوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ناول سے متعلق اپنی آراء سے آگاہ کرنا ہرگز مت بھولیے گا۔ ہمارا پتا وہی پرانا ہے:

ایڈیٹر، ”سنڈے میگزین“ روزنامہ جنگ، شعبہ میگزین، اخبار منزل، آئی آئی چندر نگر روڈ، کراچی۔ ای میل:

sundaymagazine@janggroup.com.pk

بہروز کی آواز سن کر ایک لمحے کے لیے تو جیسے میرا خون ہی خشک ہو گیا۔ انسان بظاہر تو بڑے بڑے ڈاکے مار کر صاف بچ نکلتا ہے، مگر اس دل کے چور کی ایک چھوٹی سی چوری مچھپائے نہیں بٹھکتی۔ میں نے ہڑبڑا کر بہروز کو سلام کیا۔ ”مالک آپ واپس آ گئے.....؟“ بہروز مسکرایا ”تو کیا کچھ غلط کیا واپس آ کر۔ مگر تم لوگ اتنی دیر سے کہاں تھے؟“ میں نے نظریں اٹھکائے صرف اتنا بتایا کہ مالکن کو کچھ ضروری خریداری کرنی تھی، لہذا ہم شاپنگ مال تک گئے تھے۔ بہروز نے بظاہر اس بات کا کوئی خاص نوٹس نہیں لیا، مگر خود میرے اندر کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ انسان کے جسم اور دماغ کو سنانے اور سن کرنے کے لیے بازار میں ہزار ادویہ مل جاتی ہیں، مگر سارے زمانے کے وید، حکیم اور طبیب مل کر بھی ایسی دوا ایجاد نہیں کر پائے، جو چند لمحوں کے لیے کسی کے جاگے ہوئے ضمیر کو سلا دے۔ بہروز کے گھر واپس لوٹنے کے بعد لیلیٰ نے باہر نکلتا کم کر دیا۔ اب وہ تین چار دن بعد گھٹنے دو گھٹنے کے لیے باہر گھوم آیا کرتی، مگر زیادہ تر گھر ہی میں رہتی۔ ان دنوں میں مجھے مارتھا سے پیا نو سیکھنے کا بھرپور وقت ملا اور مینے بھر میں، انگلیاں پیانو پر خوب چلنے لگیں۔ خود مارتھا بھی میری اس تیز پیش رفت اور لگن سے بہت خوش تھی۔ ایک شام میں تنہا بیٹھا پیانو پر کسی نئی دھن کی مشق کرتے ہوئے اپنے آپ میں اس قدر رگن ہو گیا کہ مجھے انیکسی کے دروازے سے اندر ہال تک آتی قدموں کی چاپ بھی سنائی نہ دی اور چونکا اُس وقت، جب پس منظر میں بہروز کریم کی بھاری آواز گونجی۔ ”اچھا بجا لیتے ہو.....“ میں گھبرا کر چونک سا گیا اور جلدی سے کھڑا ہو گیا۔ ”معاف کیجئے“ مجھے آپ کے آنے کا پتا نہیں چلا۔“ بہروز نے غور سے میری طرف دیکھا۔ ”انسان کو اپنے اندر اتنا لگن نہیں ہونا چاہیے کہ اپنی طرف بڑھنے والے قدموں کی چاپ بھی نہ سنائی دے۔ آنے والا دشمن بھی ہو سکتا ہے۔“ میں نے دوبارہ معذرت کی۔ اس نے آگے بڑھ کر پیانو کی بے داغ سطح پر ہاتھ پھیر کر اسے غور سے دیکھا۔ ”مجھے صبا نے بتایا تھا کہ اس نے انیکسی میں پیانو رکھوا دیا ہے۔ تم نے بہت تھوڑی مدت میں اپنی مالکن کا اعتبار جیت لیا، حالاں کہ لیلیٰ صبا جیسی عورت کے خیالات اپنے حق میں بدلنا بہت مشکل کام ہے..... ایسا کیا جادو ہے تمہارے پاس پری زاد، ہمیں بھی تو بتاؤ.....؟“ میں نے چونک کر بہروز کی طرف دیکھا، مگر اس کے چہرے پر حسب معمول کوئی مثبت یا منفی تاثر نہیں تھا۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ ایسے بے تاثر چہرے والے لوگ، بہت غیر متوقع شخصیت کے مالک ہوتے ہیں۔ میں پُچھ رہا۔ بہروز چند ضروری ہدایات دے کر واپس پلٹ گیا۔

اگلے ہفتے کی ابتدا ہی سے محل کی نئی سجاوٹ اور تزئین شروع ہو گئی۔ پتا چلا کہ دو دن بعد لیلیٰ صبا کی سال گرہ ہے اور بہروز پچھلے سال کی طرح اسے انتہائی دھوم دھام سے منانا چاہتا ہے۔ لیلیٰ بھی انتہائی خوش دکھائی دیتی تھی، مگر نہ جانے کیوں مجھے لیلیٰ کے اس کھلے ہوئے چہرے کے پیچھے کبھی کبھی ایک بڑی گہری اُداسی چھٹی دکھائی دیتی۔ شاید بہت زیادہ خوشی اور اطمینان بھی اپنے ساتھ ایک نامعلوم سی اُداسی لے کر وارد ہوتے ہیں یا پھر ساری بات تووازن کی ہے۔ تھوڑی سی پریشانی، بے قراری اور بے چینی بھی ضروری ہے، زندگی کے تراز کو برابر رکھنے کے لیے۔ اگلے روز جب بہروز سال گرہ کی تیاریوں میں مصروف تھا اور محل کے دالان میں بیٹھا ہم سب کو مختلف ہدایات دے رہا تھا کہ اچانک فیروز خان پریشانی میں تیز تیز قدم اٹھاتا بہروز کے قریب آیا اور تھک کر بہروز کے کان میں کوئی بات کہی۔ لیلیٰ بھی اُسی وقت وہاں پہنچی تھی، اس نے بہروز کے چہرے پر پریشانی اور کشمکش کے آثار دیکھے تو فیروز خان کو جھڑک دیا۔ ”تمہیں کتنی بار منع کیا ہے میں نے فیروز، یوں وقت بے وقت انھیں پریشان مت کیا کرو۔“ فیروز سر جھکائے کھڑا رہا۔ بہروز نے فیروز کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”ایک آدھ دن آگے نہیں ہو سکتا یہ سودا.....؟“ ”نہیں مالک! وہ لوگ بہت دور سے آئے ہیں۔ اتنا لمبا انتظار نہیں کریں گے ہمارا۔ ان کا زیادہ دیر جزیروں پر انتظار کرنا بھی خطرے سے خالی نہیں۔“ بہروز نے ایک گہری سانس لی ”مگر فیروز خان! تم جانتے ہو کل تمہاری مالکن کی سال گرہ ہے، اور میں پورا سال اس دن کا انتظار کرتا رہا ہوں۔“ لیلیٰ نے چلا کر پوچھا۔ ”کوئی مجھے بھی بتائے گا۔ یہ سب کیا چل رہا ہے.....؟“ بہروز نے ٹھنڈے لہجے میں لیلیٰ کو بتایا کہ ایک بہت ضروری سودے کے لیے اسے دوراتوں کے لیے ایک قریبی جزیروں پر جانا تھا۔ یہ سودا پہلے سے طے شدہ تھا، مگر فیروز نے ابھی آگے بتایا کہ انہیں آج شام ہی نکلنا ہوگا۔ لیلیٰ یہ سنتے ہی غصے سے کھڑی ہو گئی۔ ”ٹھیک ہے آغا! تو پھر آپ جائیں اپنے ضروری سودے کے لیے، مگر مجھ سے بھی دوبارہ کبھی بات کرنے کی کوشش نہ کیجیے گا۔ نہیں منانی مجھے کوئی سال گرہ وغیرہ۔“ لیلیٰ پیر ہنستے ہوئے اندر چلی گئی اور بہروز اسے آوازیں دیتا رہ گیا۔ لیلیٰ کے جانے کے بعد بہروز نے غصے سے گھور کر فیروز کی طرف دیکھا۔ ”کردیا ناں اسے ناراض، فیروز خان۔ تم کبھی موقع محل دیکھ کر بات نہیں کرتے۔ جاؤ، چلنے کی تیاری کرو۔“ میں اسے منا کرتا ہوں.....“ بہروز بھی اٹھ کر اندر چلا گیا۔ جانے اس نے کس طرح اپنی محبوب بیوی کو رضامند کیا ہوگا، مگر جب شام کو وہ گھر سے رخصت ہونے کے لیے نکلا تو لیلیٰ صبا بھی اسے پورے جھگڑنے کے لیے آئی، البتہ اس کے چہرے پر خفگی کے آثار ابھی تک نمایاں تھے اور وہ بھی کبھی سی دکھائی دے رہی تھی۔ بہروز کریم جانے سے پہلے جلد واپس لوٹنے اور پھر بہت دن اس کے ساتھ رہنے کے وعدوں کے ساتھ رخصت ہو گیا۔ لیلیٰ بھی پلٹ کر اندر چلی گئی۔ انسان ساری زندگی وعدے کرنے اور وعدے نبھانے کی زنجیر ہی سے بندھا رہتا ہے اور شاید ہم دوسروں سے

کیے وعدے تو نبھا بھی لیتے ہیں، مگر اپنے آپ سے کیے وعدے سدا وفا ہونے کا انتظاری کر رہتے ہیں۔ میں نے بھی اپنے آپ سے ایک وعدہ کیا تھا کہ اب اگر لیلیٰ نے مجھ سے کہیں اکیلے جانے کی ضد کی تو میں اسے صاف بتا دوں گا کہ میں بہروز کے ساتھ مزید غداری نہیں کر سکتا۔ ہاں، یہ غداری ہی تو تھی کہ میں بہروز کی دی ہوئی ہدایات پر پوری طرح عمل نہیں کر پا رہا تھا۔ دوسرے روز حسب توقع لیلیٰ نے سر شام ہی کہیں جانے کی ٹھان لی۔ اور ہم گاڑی میں ان ہی اپارٹمنٹس کی پارکنگ میں پہنچ گئے، جہاں ساتویں منزل پر لیلیٰ کی سیٹلی رہتی تھی۔ میں نے لیلیٰ سے دبے لفظوں میں کہا کہ ہمیں یہاں زیادہ دیر نہیں ٹھہرنا چاہیے، کیونکہ مالک نے مجھے جاتے ہوئے خاص طور پر ہدایت کی ہے کہ ان دنوں میں لیلیٰ کے ساتھ کہیں بھی باہر نکلنے سے گریز کروں، کیونکہ وہ جس بڑے کاروباری سودے کے لیے گھر سے جا رہے ہیں، وہ اس کے حریفوں کے دلوں میں کاروباری رقابت کی آگ مزید سلگا کر انہیں کوئی بھی انتہائی قدم اٹھانے پر مجبور کر سکتا ہے۔ لیلیٰ نے میری بات سن کر ایک گہری سانس لی۔ ”ہاں، وہ جاتے ہوئے مجھے بھی گھر سے نہ نکلنے کی تاکید کر گئے ہیں۔ مگر تم فکر نہ کرو۔ میں جلدی مل کر واپس آ جاؤں گی۔ میری دوست نے میری سالگرہ کے لیے خاص اہتمام کر رکھا ہے۔ نہ آتی تو وہ مجھ سے ناراض ہو جاتی۔“ لیلیٰ تیزی سے لفٹ کی جانب بڑھ گئی اور میں اپنے ساتھ کیے وعدے کی لاش اپنے کاندھوں پر اٹھائے، وہیں تہہ خانے کی پارکنگ میں کھڑا رہ گیا۔

شام تیزی سے ڈھل رہی تھی اور پارکنگ لاٹ میں لگی بٹیاں دھیرے دھیرے ایک ایک کر کے جلنا شروع ہو چکی تھیں۔ جب لیلیٰ کو گئے تین گھنٹے سے زیادہ ہونے کو آئے تو میں نے خود اوپر جانے کا فیصلہ کر لیا۔ ابھی قدم بڑھائے ہی تھے کہ لیلیٰ تیزی سے لفٹ سے نکل کر میری جانب بڑھتی نظر آئی۔ وہ اپنا اسکارف لپیٹ کر پرس میں رکھ رہی تھی۔ ”آپ نے بہت دیر کر دی۔ آج تو ہم نے آتے وقت آپ کی ہدایت کے مطابق محافطوں کی گاڑی کو بھی منزل سے آگاہ نہیں کیا تھا، وہ سب وہاں گھر میں بے چین ہوں گے۔“ لیلیٰ نے جلدی سے گاڑی کا دروازہ کھولا۔ ”ہاں! بس دیر ہو گئی، مگر اب چلو۔ ہمیں وہاں گھر میں یہی تاثر دینا ہے کہ ہم قریبی مال سے روزمرہ کی چند ضروری چیزیں لینے کے لیے اچانک نکل گئے تھے، لہذا بتانے کا موقع ہی نہیں ملا۔“ میں بھی جلدی سے گاڑی کی طرف بڑھا اور ٹھیک اُسی وقت تہہ خانے کی مصنوعی سرد فضا میں ایک بھاری آواز گونجی۔ ”ایسی بھی کیا جلدی ہے جان آغا! دیکھو ہم تو تمہاری تلاش میں خود ہی چل کر یہاں تک آ پہنچے ہیں۔“ میرے قدموں تلے زمین سرک گئی، دو راندھیرے میں ایک ستون کی آڑ میں کھڑی گاڑی سے بہروز کریم اور فیروز خان اتر کر ہماری جانب بڑھتے دکھائی دیے۔ پس منظر میں محافطوں کی وہ جیب بھی نظر آئی، جسے میں اور لیلیٰ اپنی دانست میں چمکے دے کر گھر ہی میں چھوڑ آئے تھے۔ لیلیٰ کے چہرے کا رنگ بھی پل بھر میں زرد پڑ گیا اور میں نے اس کے جسم میں باقاعدہ کاپٹن جیسی لرزش دیکھی۔ بہروز نے لیلیٰ کے قریب پہنچ کر پیار سے اس کی ٹھوڑی اٹھا کر لیلیٰ کا ٹھکا ہوا چہرہ بلند کیا۔ ”یہ کیا بات ہوئی جان آغا! میرے منع کرنے کے باوجود تم گھر سے نکل آئیں۔ کیا کوئی نئی سیٹلی بنائی ہے تم نے یہاں۔ ہمیں بھی تو اس سے ملو!۔ جس کے پیار میں اتنی کشش ہے کہ تم اپنے محبوب آغا کے حکم کا مان بھی نہ رکھ پائیں۔“ لیلیٰ نے جلدی سے ٹھک کر بہروز کے پاؤں پکڑ لیے ”معاف کر دیں مجھے آغا! بڑی بھول ہو گئی مجھ سے۔ مجھے واقعی گھر سے باہر نہیں نکلنا چاہیے تھا۔ مگر میں کسی کی باتوں کے بہکاوے میں آ گئی تھی۔ آئندہ ایسی غلطی کبھی نہیں ہوگی۔“ بہروز کا چہرہ اب بھی سپاٹ تھا۔ ”میں تمہیں تو معاف کر دوں گا جان آغا! مگر اُسے کبھی معاف نہیں کروں گا، جس نے تمہیں بہکا کر گھر سے نکالا اور میری حکم عدولی کی۔ بتاؤ، کون ہے وہ بد نصیب.....“ لیلیٰ نے اپنا آنسوؤں سے بھیگا چہرہ اٹھایا ”کہاناں آغا، بڑی غلطی ہو گئی۔ میں گھر میں بیٹھے بیٹھے ادب گئی تھی۔ اس لیے یہاں چلی آئی۔ یہاں ناپ فلور پر ایک بہت اچھا ریسٹوران ہے۔ سوچا، کافی پی کر دل بہلا لوں گی۔ اور مجھے اس بات کا بہت افسوس ہے۔“ بہروز نے دوبارہ سختی سے پوچھا ”کون ہے وہ، جس نے تمہیں یہاں آنے پر مجبور کیا.....؟“ لیلیٰ دھیرے دھیرے کھڑی ہو گئی اور اس نے اپنی انگلی میری جانب اٹھادی۔ ”یہ پری زاد..... یہی مجھے اس طرح کی الٹی سیدھی پٹیاں پڑھاتا رہتا تھا کہ یہ زندگی میری اپنی ہے، مجھے اسے اپنی مرضی سے جینا چاہیے۔ میں کوئی جنجرے میں قید، قیدی تو نہیں ہوں کہ ہر لمحہ گھٹ گھٹ کر جیوں۔“ لیلیٰ چیخ چیخ کر مجھ پر الزام لگاتی رہی اور میں تو جیسے پل بھر ہی میں اپنے حواس کھو بیٹھا تھا۔ مجھ سے کچھ کہا ہی نہیں گیا۔ ایک لمحے کو میری لیلیٰ سے نظر ملی اور مجھے لگا، میرے سامنے لیلیٰ نہیں ناہید کھڑی ہے اور ہم دینی میں نہیں، میرے پرانے محلے میں کھڑے ہیں۔ بہروز کریم نے اطمینان سے لیلیٰ صبا کی بات سنی اور میری طرف پلٹا ”اچھا..... تو یہ ہے وہ نمک حرام..... اس سے مجھے ایسی امید ہرگز نہ تھی۔ مگر جان آغا، تمہیں تو کچھ خیال کرنا چاہیے تھا ناں۔ اگر اس کی نیت میں کوئی فتور پیدا ہو جاتا اور میرے دشمنوں کے ساتھ مل کر یہ تمہیں کوئی نقصان پہنچا دیتا تو سوچو، پھر میرا کیا ہوتا۔“ مجھے ایک غلام کی باتوں میں نہیں آنا چاہیے تھا۔ ”لیلیٰ روتے ہوئے گڑ گڑائی ”آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں آغا، اس پری زاد نے اپنے ذرا سے فائدے کے لیے مجھے میری راہ سے بھٹکا دیا۔ میری ہم دردی حاصل کرنے کے لیے میرے دل میں بغاوت کی چنگاری بھڑکا دی۔ آپ تو جانتے ہیں، میں آپ کے بنا کتنی تنہا پڑ جاتی ہوں۔ یہ ضرور مجھے کوئی نقصان پہنچانا چاہتا ہوگا۔ تب ہی مجھے یوں اکیلے گھر سے نکلنے پر اکساتا رہا۔ اچھا ہوا آپ لوگ ٹھیک وقت پر یہاں پہنچ گئے۔“ میں حیرت سے لنگ اور اپنی جگہ جما کھڑی لیلیٰ کی یہ ساری خرافات سُنتا رہا۔ بہروز دھیرے دھیرے چلتا میرے قریب آیا اور اس کی آنکھیں میری آنکھوں میں گڑ گئیں۔ ”تم بتاؤ پری زاد..... کیا لیلیٰ ٹھیک کہہ رہی ہے؟ اور کوئی بھی جواب دینے سے قبل اتنا ضرور سوچ لینا کہ بہروز کریم کی عدالت میں غداری کی صرف ایک سزا مقرر ہے، سزائے موت۔“ میں نے ایک پل کے لیے نظر اٹھا کر لیلیٰ کی طرف دیکھا۔ وہ لاطعلقی سی کھڑی تھی۔ بہروز دوسری بار زور سے چلا یا۔ ”جواب دو!۔“ لیلیٰ نے کیا یہ سچ ہے.....؟“ میں نے سر جھکا لیا ”جی ہاں، مالکن جو کہہ رہی ہیں، سچ کہہ رہی ہیں۔ میں ہی انہیں بہانے سے گھر سے باہر لے کر آیا تھا۔“ ایک لمحے کے لیے لیلیٰ کی آنکھوں میں بے یقینی کی ایک چمک لہرائی، مگر پھر فوراً ہی اس نے خود کو ناپل کر لیا۔ بہروز کریم نے سرسراتی آواز میں مجھ سے پوچھا ”کوئی آخری خواہش ہو تو بتا دو۔ تمہاری گنتی کی چند سانس باقی رہ گئی ہیں۔“ میں نے بہروز کی طرف دیکھا ”جی مالک..... بس ایک آخری خواہش ہے۔ مجھے مارنے کے بعد میرا چہرہ مسخ کر دیجیے گا۔ میں نے یہ زندگی تو جیسے تیسے اس چہرے کے ساتھ گزار لی۔ مگر میں قبر میں اس شناخت کے ساتھ ہرگز نہیں جانا چاہتا۔“ بہروز کچھ دیر تک میری طرف دیکھتا رہا، مجھے اس کے لہجے میں پہلی بار اپنے لیے غصے سے زیادہ افسوس کا عنصر محسوس ہوا۔ ”جانتے ہو، مرد کی بربادی